جلد ۷۲
عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

فروری ۱۹۷۰ء

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶	فروری ۱۹۷۰ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ	جلد ۷۲

مغربی پاکستان — مشرقی پاکستان

سالانہ چندہ سات روپے — ماہنامہ ترجمان القرآن — (ہوائی ڈاک): ۸ روپے ۵۰ پیسے

فی پرچہ ۷۵ پیسے — ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور — فی پرچہ: ۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

قیامِ پاکستان کے ۲۳ سال بعد اکتوبر ۱۹۷۰ء میں اس ملک کے لوگوں کو پہلی مرتبہ بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخاباتِ عام کا موقع مل رہا ہے۔ یہ موقع ہماری زندگی کا ایک ایسا نازک اور فیصلہ کن مرحلہ ہے جس میں اگر ہم نے امانت، دیانت، احساس ذمہ داری، اللہ کے دین سے حقیقی اور سچی وفاداری کا ثبوت نہ دیا اور قومی اور دینی تقاضوں کے مقابلے میں علاقائی، خاندانی اور ذاتی مصلحتوں کو نظرانداز کرنے کا رویہ اختیار نہ کیا تو پورا ملک شدید خطرے میں پڑ جائے گا اور اس سے نہ صرف اہلِ پاکستان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا بلکہ پوری دنیائے اسلام میں اسلامی محاذ اور دینی تحریکات کی پوزیشن کمزور ہو گی۔ اس مرحلے پر ہم اس ملک کے بہی خواہوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا چاہتے ہیں اور ان پر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت ایک لمحہ کی غفلت یا کسی ایک آدھ معاملے میں بے تدبیری بھی کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

ایک مسلمان کے لیے یہ بات بالکل ناقابلِ تصور ہے کہ وہ اسلام کے سوا کسی دوسرے نظام کا علمبردار ہو اور دین کی خدمت کے سوا کسی دوسرے نظریۂ حیات کی خدمت کو اپنی زندگی کا مطلوب و مقصود قرار دے۔ اس حد تک تو تمام مسلمانوں کو بالکل یکسو ہونا چاہیے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ وہ دین کی خدمت کے لیے کس جماعت کے ساتھ وابستہ ہو کر کام کرے۔ جماعت اسلامی نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ دین کی خدمت صرف اسی سے وابستہ ہو کر کی جا سکتی ہے۔ بھلائی کا کام جو گروہ بھی کرے ہم انشاء اللہ ممکن حد تک اس سے تعاون کریں گے۔ البتہ جو لوگ اسلام سے سچی محبت اور وابستگی رکھتے ہیں اور

وہ اپنے انداز پر کوئی الگ کام بھی نہیں کرسکتے بلکہ کسی اجتماعی جدوجہد میں شریک ہو کر کام کرنا چاہتے ہیں، ان کی خدمت میں ہم جماعت اسلامی کا مختصر تعارف، اُس کے کام کرنے کا طریقہ اور اس کے مقاصد اور پھر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اُس کی انتخابی مہم کی نوعیت بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرسکیں۔

جماعت اسلامی کے تعارف کے لیے مختصر طور پر صرف ایک ہی بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ جماعت درحقیقت مسلمانوں کو ان کا اصل فرض یعنی اقامتِ دین یاد کرانے کے لیے اٹھی ہے اور اپنے محدود وسائل کی حد تک خود اسی فرض کی انجام دہی میں سرگرم عمل ہے۔ اقامت دین یا دوسرے الفاظ میں باطل نظامہائے حیات کی جگہ نظامِ حق کا نفاذ، چونکہ ایک ہمہ گیر کام ہے اس لیے جماعت کا دائرۂ عمل بھی بڑا وسیع ہے۔ اس نے خدا کے فضل اور اس کی تائید سے جہاں غیر اسلامی افکار و نظریات کی علمی اور مؤثر انداز سے تردید کی ہے وہاں عملی اعتبار سے بھی ہر کافرانہ نظامِ زندگی کا راستہ روکنے کی کوشش کی ہے اور اس راہ میں ہر قسم کے مصائب اور لعن طعن اور الزام تراشیوں کو برداشت کیا ہے۔ اگر یہ جماعت محض علمی سطح پر رہ کر مختلف موضوعات پر تحقیقی کام کرتی رہتی یا اپنی سرگرمیاں محض وعظ و تلقین تک محدود رکھتی تو باطل کبھی بھی اس کے پیچھے اس طرح پنجے جھاڑ کر نہ پڑتا جس طرح کہ اب پڑا ہوا ہے۔ لیکن چونکہ اس کے اثر و نفوذ سے دنیائے عمل میں باطل کا تسلط ختم ہوتا ہے اس لیے وہ اس جماعت کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے اور اسے مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہا ہے۔

جماعت اسلامی کے کام کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس ماحول کو نگاہ میں رکھا جائے جس میں یہ سرگرم عمل ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے بین الاقوامی صورتِ حال کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت بظاہر دنیا دو مختلف بلاکوں میں منقسم ہے۔ سرمایہ دارانہ جمہوری بلاک اور اشتراکی بلاک۔ لیکن اگر تہذیبی اور نظریاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ دونوں بلاک بعض

اختلافات کے باوجود ایک ہی نظریہ کے حامل اور ایک ہی تمدن کے علمبردار ہیں۔ یہ دنیا میں مادی اقدار اور مادی تہذیب کو غالب اور حکمران دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ سرمایہ دار ممالک میں کسی قوم کی اجتماعی قوت کو سرمایہ کے ارتکاز سے متعدد مقامات پر مرتکز کرکے مذہب کو غیر مؤثر قوت بنایا جاتا ہے۔ اور اشتراکیت اس اجتماعی قوت کو ایک مقام پر جمع کرکے اسے مذہب کے خلاف بے دریغ استعمال کرتی ہے۔ ان دونوں نظاموں کے درمیان نوعیت کا کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک مفکر کے بقول سرمایہ داری جس چیز کو پرچون کے طور پر فروخت کرتی ہے، اشتراکیت اُسے تھوک کے بھاؤ بیچتی ہے۔

ان دونوں نظاموں کی نظریاتی اساس ایک ہونے کی وجہ سے ان کے طرزِ عمل میں بھی آہستہ آہستہ یگانگت پیدا ہو رہی ہے۔ وربین الاقوامی معاملات میں انہوں نے ایک دوسرے کا حریف بننے کے بجائے ایک دوسرے کا حلیف بننا پسند کرلیا ہے۔ سرمایہ داری نے جمہوریت اور فرد کی آزادی کی راہ سے مادی تہذیب کی تشکیل کی ہے، اور اشتراکیت نے آمریت کی راہ سے اور فرد کی آزادی سلب کرکے مادی تہذیب کا قصر تعمیر کیا ہے۔ اب جبکہ تہذیب کے یہ دونوں قصر آمنے سامنے کھڑے ہیں، غور و فکر کرنے والے اپنی آنکھوں سے ان دونوں کے درمیان پوری ہم رنگی کا مشاہدہ کر رہے ہیں، اگرچہ ان دونوں کی تعمیر کا انداز ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ خود ان دونوں نظاموں کے علمبرداروں میں بھی آہستہ آہستہ یہ احساس ابھر رہا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ایک دوسرے سے بیگانگی کا طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہیں، حالانکہ ان کے اندر نظریاتی اعتبار سے کوئی بُعد نہیں۔ اختلاف جو کچھ تھا وہ تدبیرِ منزل کا تھا۔ منزل دونوں کی ایک ہے، یعنی مادی تہذیب کی تشکیل اور پوری دنیا پر اس کا تسلط۔

ان دونوں نظاموں کے مابین اختلافات کی جو خبریں کبھی کبھی اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں ان کے پیچھے کسی نظریاتی اختلاف کا پتہ نہیں چلتا۔ لے دے کر ایک ہی چیز سامنے آتی ہے کہ دنیوی مفادات کی تقسیم اور بٹوارے کے معاملے میں بسا اوقات رنجشیں اور تلخیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان اس اتحاد و اتفاق کی رُوح کو سمجھنے کے لیے یُوں تو حال میں کئی ایک نئی کتابیں سامنے آئی ہیں، مگر دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک کوپ لینڈ کی کتاب

GAMES OF THE NATIONS - اور دوسری سینا ٹی کی کتاب A CHALLENGE TO MODERNIZATION -

ان دونوں کتابوں کا اگر غور سے مطالعہ کر لیا جائے تو امریکہ اور روس اور مغرب کی دوسری قوموں کا مشرقی اقوام، خصوصاً مسلمانوں کے بارے میں طرزِ عمل پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے اور اس امر کا بالکل صاف پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مغربی تہذیب کے سارے علمبرداروں کی کوشش یہی ہے کہ مشرق کسی طرح اپنی تہذیب کو از سرِ نو زندہ کر کے کہیں اُسے مغربی تہذیب کے مقابلے میں بطور ایک چیلنج کھڑا نہ کر دے۔ اس معاملے میں انہیں خاص طور پر مسلم ممالک کی طرف سے خطرہ ہے کیونکہ مسلمانوں کے سوا دنیا کی کوئی قوم اپنے پاس تہذیب و تمدن کا ایسا سرمایہ نہیں رکھتی جس کی مدد سے فکر و عمل کا ایک جامع نظامِ زندگی تشکیل کیا جا سکے۔ اس لیے امریکہ اور روس دونوں کو اس بات کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ مسلمان ممالک ان دو میں سے کسی ایک کے ہمیشہ دست نگر رہیں۔ اب ان کی پالیسی کا انداز یہ ہے کہ پہلے ایک ملک مشرق کے کسی حصے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھاتا ہے مگر جب اُس کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اس کے خلاف ردِ عمل پیدا ہونا شروع ہوتا ہے تو فوراً دوسرا آگے بڑھ کر خلا کو پورا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ مصر ہی کو لیجیے۔ وہاں جب انقلابی حکومت قائم ہوئی تو امریکہ ایک مؤثر قوت کی حیثیت سے ایک خاص کردار ادا کر رہا تھا، بلکہ کوپ لینڈ کے قول کے مطابق یہ سارا ڈرامہ ہی امریکہ کی شہ پر کھیلا گیا۔ مگر جب امریکہ ان توقعات کو پورا نہ کر سکا جس کے وعدے اس نے انقلاب کے علمبرداروں سے کر رکھے تھے اور ان کے اندر بددلی پھیلنے لگی اور امریکہ کے خلاف نفرت کا ایک عام رجحان پیدا ہونے لگا تو فوراً روس نے دستِ تعاون بڑھایا اور انہیں اس امر کا یقین دلایا کہ وہ ان کا حقیقی خیر خواہ ہے لہٰذا اہلِ مصر اور ان کے حلیفوں کو اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ مگر روس نے اسرائیل اور عرب کی جنگ میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے اس کے اخلاص کا سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ اس میں جس نیم دلانہ تعاون کا مظاہرہ کیا گیا اسے دیکھتے ہوئے ایک انسان بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اس کا مقصد امریکہ اور اسرائیل کی کوئی مؤثر مخالفت یا عربوں کی بھرپور حمایت نہ تھی بلکہ یہ محض اشک شوئی تھی تاکہ عرب روس سے بددل ہو کر معاونت کے لیے کسی اور طرف رجوع نہ کریں۔

خود پاکستان کے حالات امریکہ اور روس کی اس ملی بھگت کی شہادت فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے اس ملک میں ایک مدت تک امریکہ کا غیر معمولی اثر قائم رہا اور خارجی اور داخلی تعلقات میں ہم اس کا اشارہ ابروئے چشم پاکر ہی ہر قدم اٹھاتے رہے۔ اس کے افکار و نظریات اور اس کی تہذیب و تمدن کو ہم نے اپنے ہاں رواج دینے کی کوشش کی۔ مگر ساتھ ساتھ اشتراکی نظریات کو بھی بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے پورے مواقع فراہم کیے گئے اور اس معاملے میں بھی کسی قسم کی مزاحمت نہ کی گئی۔ امریکہ اور روس دونوں اس بات سے خوش تھے کہ اس ملک میں الحاد اور مادیت سرایت کرتی جا رہی ہے اور اسلامی تعلیمات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ جہاں تک مغربی اقدار کی ترویج و اشاعت کا تعلق ہے دونوں ایک دوسرے کے ہم عنان تھے، بلکہ بسا اوقات کھلے طور پر ایک دوسرے کی معاونت اور دستگیری بھی کرتے تھے۔ بہت سی ایسی انجمنیں اور ادارے اور تنظیمیں جو ثقافت اور آرٹ کے نام پر اس ملک کی اخلاقی اساس کو برباد کرنے میں منہمک تھیں ان کی امریکہ اور روس دونوں طرف سے حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔ مگر جب سیاسی مصالح کے نقطۂ نظر سے امریکہ نے کھل کر بھارت کی حمایت شروع کی اور پاکستان سے منہ موڑ لیا تو روس نے ہمارے ارد گرد ایسی جذباتی فضا پیدا کر دی جس کے تحت ہم اس کی طرف نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھنے پر مجبور ہوئے۔ پاک بھارت جنگ کے بعد معاہدۂ تاشقند میں جس طرح روس نے امریکہ کی خواہش کے عین مطابق پاکستان کو بعض ذلت آمیز شرائط پر بھارت سے صلح کرنے پر مجبور کیا وہ ان دونوں ملکوں کی ملی بھگت کی کھلی شہادت ہے۔ جو کام امریکہ نہ کر سکتا تھا وہ اس نے روس کے ذریعے کروایا اور اس امر کی کوشش کی کہ ہم اب روس پر اعتماد کرنا شروع کر دیں تاکہ ان دونوں بتوں سے مایوس ہو کر کہیں یکسوئی کے ساتھ اپنے خدا کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں اور اپنی دنیا خود اپنی نظریاتی اور تہذیبی بنیاد پر تعمیر کرنے کا عزم نہ کریں۔

امریکہ اور روس کے درمیان ممکن ہے سامراجی عزائم کی تکمیل کے معاملے میں کچھ اختلافات ہوں اور مادی مفادات کی تقسیم کے سلسلے میں ان کے مابین کبھی کبھی تلخی اور رنجش پیدا بھی ہو جاتی ہو، مگر

اسلام کو مٹانے اور اس کے مقابلے میں غیر اسلامی نظریات اور اقدار کو قوت بہم پہنچانے اور اسلام کے علمبرداروں کی طاقت کو توڑنے کے معاملے میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ مسلم ممالک میں احیائے اسلام کے لیے جو تحریکات کام کر رہی ہیں، یہ دونوں ممالک انہیں برباد کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں اور جب بھی انہیں کسی طرف سے زک پہنچائی جاتی ہے انہیں بےحد خوشی ہوتی ہے۔ اخوان المسلمین کی تباہی پر امریکہ اور روس دونوں کو جس قدر خوشی اور مسرت ہوئی وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ پاکستان کی جماعت اسلامی اور اس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف آئے دن امریکی پریس، اور نام نہاد امریکی مصنفین جس قسم کا مواد پیش کرتے رہتے ہیں اُن سے اُن کے ناپاک عزائم کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں پاکستان کے سیاسی معاشرتی اور معاشی حالات کے بارے میں متعدد کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان سب میں جماعت اسلامی کے بارے میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ یہ چند تنگ نظر رجعت پسند اور دقیانوسی ملاؤں کی ایک فاشسٹ تنظیم ہے جو قوت کے بل بوتے پر معاذ اللہ ایک فرسودہ اور بیکار نظامِ حیات نافذ کرنا چاہتی ہے، اس کے ماننے والوں میں اندھے جوش کے سوا کوئی چیز نہیں، دقیانوسیت ان کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس معاملہ میں اگر کوئی شخص ان لوگوں کے خیالات کی چند جھلکیاں دیکھنا چاہتا ہے تو اسے FREELAND ABBOT اور BINDER کی تحریروں پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اِن سے اسے ان کے رجحانات اور عزائم کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ یہ لوگ اسلام کے اُن سارے خادموں کے دشمن ہیں جو مسلمانوں کو دینِ حق کی دعوت دیتے ہیں اور انہیں اس بات پر سرگرمِ عمل کرتے ہیں کہ وہ اس دین کی اساس پر اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کریں اور پھر اس دین کو دنیا کی ایک غالب قوت بنانے کے لیے جدوجہد کریں۔ اوّل تو ان غیر مسلم قوموں کو اسلام کے نام ہی سے چڑ ہے۔ لیکن اگر وہ مسلم قوم کے مزاج کو سامنے رکھ کر اس کی کوئی صورت گوارا کرنے پر آمادگی کا اظہار بھی کرتی ہیں تو دین کی اس شکل کو برداشت نہیں کرتیں جس کا عملی نمونہ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے جلیل القدر صحابہ یا دوسرے صلحائے امت میں ملتا ہے بلکہ ان کے نزدیک اگر کوئی دین پسندیدہ ہے تو وہ جو مغربی تہذیب کا چربہ ہو اور جس میں اسلام کے نام پر مغربی تہذیب اور اس کی اقدار کو

فروغ دینے کا التزام ہو۔

یہ ہیں وہ حوصلہ شکن بین الاقوامی حالات جن میں جماعت اسلامی کام کر رہی ہے۔ اب ملک کے اندر دیکھیے تو یہاں متعدد گروہ اور طبقے اسلام کا راستہ روکنے کے لیے پوری طرح کوشاں ہیں۔ یہ تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ جو ملک دینی امنگوں کی تکمیل کے لیے — — — — — — — — — — — — مال و جان اور عزت و آبرو کی بے پناہ قربانیوں سے حاصل کیا گیا تھا اس میں دینِ حق کے خلاف مسلسل سازشیں کی جا رہی ہیں۔ یہ سازشیں کرنے والے تعداد میں بلاشبہ کم ہیں اور دین سے محبت رکھنے والوں کے مقابلے میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ مگر چونکہ اختیارات کی باگیں شروع ہی سے اس مختصر طبقے کے ہاتھ میں رہی ہیں اس لیے اُس نے انتظامیہ کی قوت اور ملکی وسائل کو اسلام کے خلاف دل کھول کر استعمال کیا ہے۔ اس طبقے نے کئی ایک محاذوں پر کام کر کے اشتراکیت کی راہ ہموار کی۔ سب سے پہلے تو اس نے دورِ غلامی کی برائیوں کو جُوں کا تُوں قائم رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا تاکہ عوام کے اندر پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بددلی پیدا ہو اور وہ یہ سوچنے لگیں کہ پاکستان اور اسلام کے نام پر اُن کے ساتھ شرمناک کھیل کھیلا گیا ہے۔ ان لوگوں نے نہ صرف انگریز کے عہد کی جاگیرداریوں کو قائم رکھا بلکہ نئی جاگیرداریاں پیدا کیں اور جاگیرداروں کو اس بات کی کھلی چھٹی دی کہ وہ مزارعین کے ساتھ جس قسم کا ظالمانہ سلوک چاہیں کریں۔ یہ جاگیردار حکومت میں ایک مؤثر قوت کی حیثیت سے شریک رہے۔ ان بدترین حالات کے ساتھ ساتھ برسرِ اقتدار طبقے اسلام سے محبت کا اظہار بھی برابر کرتے رہے۔ اس سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کے ذہنوں کے اندر یہ باطل خیال بٹھایا جاسکے کہ اسلام اس ظالم نظام کا مؤید اور حامی ہے اور اسے صرف اشتراکیت کے ذریعے ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔

جس وقت ملک تقسیم ہوا اس وقت ہمارے نظامِ معیشت کی ہیئت اگرچہ سرمایہ دارانہ تھی مگر ابھی تک اس میں اُن برائیوں کو سر اٹھانے کے پوری طرح مواقع نہ ملے تھے جن کی وجہ سے آج اس نظام نے

غریبوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اگر اصحاب اقتدار بدنیت نہ ہوتے تو وہ عزم اور تدبیر اور تھوڑی سی محنت کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کو مٹا کر اس کی جگہ اسلامی نظامِ معیشت کی تشکیل کر سکتے تھے۔ مگر حکومت کے اندر غیر دینی عناصر نے جان بوجھ کر ملکی معیشت کی تعمیر خالص سرمایہ دارانہ نظام کے مطابق کی، بلکہ یہاں سرمایہ داری کو ان سارے مفاسد کے ساتھ اُبھارا جن سے ایک لمبے تجربے کے بعد اب سرمایہ دارانہ ممالک پیچھا چھڑا چکے ہیں یا چھڑا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اس امر کا خاص طور پر اہتمام کیا کہ ملکی دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے، اور یہ ہاتھ اتنے مضبوط ہوں کہ پُورے ملک کو اپنی گرفت میں لے سکیں۔ پھر نوکر شاہی، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے گٹھ جوڑ سے غریبوں کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی کوشش کی گئی اور ہر گوشۂ حیات میں اس قدر لوٹ مچائی گئی کہ عوام کے لیے جینا دوبھر ہو گیا۔ اس کے بعد یہ تخیل پیش کرنا شروع کر دیا گیا کہ اصلاحِ حال کی کوئی صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ ملک کے سارے وسائلِ رزق براہِ راست حکومت کی تحویل میں دے دیے جائیں، عوام اس کے ہاتھ میں بے بس ہو جائیں اور حکومت لوگوں کو نپا تلا چارہ مہیا کرنے کا کوئی بندوبست کر دے۔ ان لوگوں نے جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعے بعض لوگوں کے ذہنوں کو اس قدر ماؤف کر دیا ہے کہ وہ یہ باور کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے کہ عوام آزادی اور عزت کے ساتھ بھی اپنی بنیادی ضروریات فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ اب مسلسل یہی تاثر دے رہے ہیں کہ زندگی کے نظام بس دو ہی ہیں۔ یا تو تم سرمایہ داری اور جاگیرداری کے استبداد کے تحت محرومیوں کے ساتھ فاقہ مستی کی زندگی بسر کرو، یا پھر ریاست کی خدائی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال کر غلامی کی زندگی اختیار کر لو۔ اشتراکیت کے اندر عوام کو معاشی اعتبار سے کس قدر آرام ملے گا یہ ایک الگ سوال ہے مگر ان لوگوں کی ہنرمندی دیکھیے کہ انہوں نے یہ فضا پیدا کر دی ہے کہ جو اشتراکیت کا مخالف ہے وہ لازمی طور پر عوامی مفاد کا دشمن، غریبوں اور ناداروں کا دشمن اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کا حامی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اشتراکیت کے علاوہ جس نظام کی بھی حمایت کی جائے وہ لازمی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت اور غریب دشمنی ہی ہے۔

جماعت اسلامی سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو لعنت سمجھتی ہے اور ایک بار نہیں بلکہ بار بار اس کا برملا اظہار کر چکی ہے مگر یہ بے دین طبقے برابر یہ کہتے چلے جا رہے ہیں کہ یہ جماعت سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ایجنٹ ہے۔ حالانکہ اس ملک میں سرخ فوج کے ہراول دستے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں پر مشتمل ہیں، بلکہ اس فوج کی کمان بھی ان دونوں طبقوں ہی کے ہاتھ میں ہے مگر اس طبقے نے اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو چھپانے کے لیے بڑی عیاری کے ساتھ عوام کے اندر یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب تک وہ اپنے حقوق ملکیت سے دستبردار ہو کر اشتراکی آمریت کو پوری طرح اپنے آپ پر مسلط نہیں کر لیتے اور روٹی کے ایک ایک نوالے کے لیے اپنے آپ کو اس کا دست نگر نہیں بنا لیتے اس وقت تک ان کی بگڑی نہیں بن سکتی۔ اس طبقے کا اشتراکیت کے حق میں پرچار اور سرخ انقلاب برپا کرنے کے لیے اس کی عملی جدوجہد کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ جو لوگ ملک کے وسائل رزق پر اس وقت مسلط ہیں وہ اُن پر اس سے کہیں زیادہ مضبوط گرفت کے ساتھ قابض ہو جائیں اور عوام میں اتنی سکت اور ہمت بھی باقی نہ رہے کہ وہ ان کے ظلم و استبداد کے خلاف لب کشائی کر سکیں۔ اشتراکیت کے ساتھ اس سرمایہ دار طبقے کی غیر معمولی دلچسپی عوام کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ اپنے لیے غیر مسئول اقتدار کے حصول کی آرزو کا نتیجہ ہے۔ یہ طبقہ چاہتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے عوام کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنائے اور اس کے اس ظلم کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہونے پائے۔ وہ لوگ جو انسانی نفسیات سے قطعاً نابلد اور ناواقف ہیں وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی اصل خواہش مال و دولت کا حصول ہے۔ درحقیقت ایک دنیا پرست انسان کی سب سے بڑی خواہش اپنی خدائی اور کبریائی کا اظہار ہے۔ وہ دولت اور مال اس لیے چاہتا ہے کہ اسے اپنی خدائی کے قیام میں ان مادی وسائل سے مدد ملتی ہے۔ انسان کا نفسِ امارہ سب سے زیادہ تسکین غیر مسئول اقتدار میں پاتا ہے کیونکہ اس کے حاصل ہو جانے کے بعد وہ ہر خواہش اور تمنا کو بلا خوف و خطر پورا کر سکتا ہے۔ اقتدار کے مقابلے میں دولت کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ دیکھیے کہ ہمارے ملک کے اکثر و بیشتر صنعت کار، تاجر اور زمیندار ہمیشہ اس امر کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ ان کے بیٹے اور بھتیجے کس طرح اعلیٰ سرکاری افسر بن جائیں۔ حالانکہ معاشی اعتبار سے

اُن کے لیے ان سرکاری عہدوں میں کوئی کشش نہیں ہوتی ۔ وہ اپنے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کو ان عہدوں پر اس لیے فائز دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان عزیزوں کی وساطت سے ملک کی انتظامیہ میں ان کا اثر و رسوخ بڑھے گا اور وہ ان کی مدد سے معاشرے پر تسلط قائم کر سکیں گے ۔ انسان کی اصل خواہش تو اقتدار کا حصول ہے ۔ دولت چونکہ اس کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اس لیے وہ دولت کی تمنا کرتا ہے۔ اس وقت ملک کے اندر نوکر شاہی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے اس اشتراک نے نچلے طبقوں کے لیے زندگی کو ایک دردناک عذاب بنا دیا ہے ۔ ایک نہایت ہی محدود سا طبقہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے اور ملک کی عظیم اکثریت کے لیے روح اور جسم کے رشتے کو برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہے ۔ دولت کی اس غیر عادلانہ تقسیم کی وجہ سے ملک کی سیاسی حالت ابتر ہوئی ہے ۔ سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر تختِ اقتدار پر براجمان ہو جاتا ہے اور پھر اس اقتدار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید دولت سمیٹتا ہے ۔ یہ ایک شیطانی چکر ہے جس میں پوری قوم گرفتار ہے ۔ دولت سے اقتدار ہاتھ آتا ہے اور اقتدار سے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا ہے ۔

یہ ہیں وہ مختصر داخلی حالات جن میں جماعت اپنا انتخابی منشور پیش کر رہی ہے ۔

منشور کے متعلق کوئی بات کرنے سے پیشتر دو باتوں کا ذکر انتہائی ضروری ہے ۔ پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ کسی پارٹی کا منشور اس کا نصب العین نہیں ہوتا بلکہ نصب العین تک پہنچنے کا درمیانی مرحلہ ہوتا ہے ۔ منشور کی حیثیت منزل کی نہیں بلکہ تدبیرِ منزل کی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لینا چاہیے ۔ منشور کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر پارٹی عوام کو نہایت واضح طور پر اس امر سے آگاہ کرے کہ اگر وہ اس پر اعتماد کرتے ہوئے عنانِ اقتدار اسے سونپ دیں تو اقتدار کی معینہ مدت کے اندر وہ منشور میں دیئے ہوئے پروگرام کی تکمیل کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح قوم کو اس منزل کے قریب تر کر دے گی جو اس کے نزدیک اس کی اصل منزل ہے ۔

دوسرے کسی منشور کی قدر و قیمت کو جانچنے کا معیار وہ حکمتِ عملی ہے جس کی بنیاد پر اسے مرتب

کیا جاتا ہے۔ اچھا منشور بے سروپا باتوں، خوش کن وعدوں، ناقابلِ عمل اسکیموں اور پروگراموں سے ترتیب نہیں پاتا بلکہ اس میں ہر قدم پر یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ اس وقت جو حالات ملک میں موجود ہیں اُن کے اندر کس انداز کی تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں جن کی مدد سے وہ قوم اپنے حقیقی نصب العین سے قریب ہو جائے۔ جو لوگ کسی قوم کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی حالات کو یکسر نظر انداز کر کے کوئی نہایت ہی جاذبِ نظر منشور عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں وہ درحقیقت ان کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ کوئی منشور خلا میں تو مرتب نہیں ہو سکتا بلکہ اجتماعی حالات، ان کی نوعیت اور دقتوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جاتا ہے اس میں ہر قدم پر اس امر کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ملک میں اس وقت جو صورتِ حال موجود ہے اُسے کس حد تک کشت و خون کے بغیر نصب العین کی روشنی میں بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

ان دونوں باتوں کو نگاہ میں رکھ کر اب منشور کا جائزہ لیجیے۔ اس منشور میں پہلے مرحلہ پر اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ پاکستان کی نظریاتی بنیاد کو مضبوط کیا جائے، اس کی وحدت اور سالمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے اور جو قوتیں اس کی نظریاتی بنیادوں کو نقصان یا اس کی سالمیت کو صدمہ پہنچانے کا عزم رکھتی ہیں ان کے راستے میں پوری طرح مزاحمت کی جائے۔ پھر مثبت طور پر اس بات کی پوری پوری کوشش کی جائے کہ عوام کے اندر دینی رجحانات زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں اور وہ فکر و عمل اور جذبہ و احساس کے اعتبار سے مسلمان بنیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے جماعت اسلامی نے اپنے منشور میں اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ اگر برسرِ اقتدار آ گئی تو نظامِ تعلیم کو اس نہج پر مرتب کرے گی جس میں ابتدا سے لے کر انتہائی مدارج تک ہر علم اور فن کی تعلیم میں خدا پرستانہ نظریات سمویا ہوا ہو، تعلیمی اداروں کے اندر اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے گا، اساتذہ کے انتخاب میں صرف ان کی تعلیمی اسناد کو ہی ملحوظِ خاطر نہ رکھا جائیگا بلکہ ان کی سیرت اور کردار کے بارے میں بھی اس امر کا اطمینان کیا جائے گا کہ وہ نوخیز نسلوں کی تربیت کرنے کی پوری طرح اہلیت رکھتے ہیں۔ پھر انگریزی زبان کی جگہ قومی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنا کر

طلباء کو ذہنی مرعوبیت سے بھی نجات دلائی جائے گی تاکہ انہیں اس قابل بنایا جا سکے کہ وہ انگریزی کی وساطت سے آئے ہوئے مغربی افکار پر ایمان لانے کے بجائے اسلامی نظریات کے علمبردار بنیں اور ذہنی غلامی سے نکل کر ایک آزاد مملکت کے آزاد شہری کی حیثیت سے غور و فکر کریں۔

اس مقصد کے تحت جماعت اسلامی نے اپنے منشور میں اس عزم کا بھی اظہار کیا ہے کہ پبلک اسکول سرکاری خرچ پر قائم کرنے اور چلانے کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔ اس وقت تعلیمی میدان میں یہ افسوسناک صورتِ حال درپیش ہے کہ تعلیمی مد کی ایک اچھی خاصی رقم غیر ملکی افکار و نظریات اور عادات و اطوار کے ان گہواروں پر صرف کی جا رہی ہے اور ان کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان قوم کے اندر برابر ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جاتا رہے جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو پاکستانی ہو مگر افکار و تصورات، جذبات و احساسات اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے مغربی ہو۔ اور پھر انگریزی زبان کی برتری قائم رکھ کر حکومت کا نظم و نسق اسی طبقے کے ہاتھ میں رکھا جائے تاکہ یہ سابق انگریز حکمرانوں کی جانشینی کا حق ادا کرتا رہے۔ انگریزی حکومت جو کام انگریز نوکر شاہی سے لیا کرتی تھی، وہی کام اب پاکستانی "صاحب بہادروں" سے لیا جا رہا ہے اور اسی مقصد کے لیے ملک میں پبلک سکولوں کا جال بچھایا گیا ہے۔ جماعت اسلامی تعلیمی میدان میں اس دو عملی کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی اور نئی نسلوں کو اس انداز سے تعلیم دینے کا بندوبست کرے گی کہ اس کے اندر طبقاتی تقسیم پیدا نہ ہونے پائے اور سارے ہونہار بچوں کو حصولِ تعلیم کے لیے ایک جیسے مواقع میسر آئیں اور وہ فکر و احساس کا مشترک سرمایہ لے کر درسگاہوں سے نکلیں۔

اس منشور میں جماعت اسلامی نے اس حقیقت کو بھی اپنی نگاہ میں رکھا ہے کہ تعلیمی درسگاہوں اور ماحول کے درمیان زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو تاکہ جب طلبا تعلیم سے فارغ ہو کر معاشرے میں قدم رکھیں تو وہ اپنے سامنے ایک بالکل اجنبی ماحول نہ پائیں بلکہ انہیں یہ احساس ہو کہ درسگاہوں کے اندر انہوں نے محدود پیمانہ پر جو دینی اور اخلاقی تربیت پائی ہے معاشرتی ماحول اسے جلا دینے اور اس میں مزید نکھار پیدا کرنے کے پورے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اسی وجہ سے جماعت نے ماحول کو اسلامی افکار و احساسات

سے معمور کرنے کے لیے بعض بڑی مؤثر تدابیر پیش کی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ زور اقامت صلوٰۃ کو فروغ دینے اور احترام رمضان کو قائم رکھنے پر دیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے کسی مسلمان قوم کے تمکن فی الارض کے ساتھ اس پر اقامتِ صلوٰۃ کی جو بنیادی ذمہ داری عائد کی ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ قیام نماز کے بارے میں اس کے احساس ذمہ داری ہی سے اس کے دینی مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے اور عوام کے اندر یہ شعور بیدار ہوتا ہے کہ یہ حکومت اسلامی تعلیمات کو نافذ کرنے کے لیے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ نماز کے اجتماعی نظام سے پورے ماحول میں دینداری پیدا ہوتی ہے اور بہت سی برائیاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔

نماز کے علاوہ جماعت اسلامی نے اپنے منشور میں اس عزم کا بھی اظہار کیا ہے کہ وہ اسلامی عقائد، احکام اور تعلیمات سے عوام کو آگاہ کرنے کے لیے تمام ممکن تدابیر اختیار کرے گی اور قانون و انتظام کی تمام طاقتوں اور حکومت کے تمام ذرائع و وسائل سے کام لے کر معاشرے کو ہر قسم کے فواحش اور اخلاقی مفاسد سے پاک کرنے کی کوشش کرے گی اور ان اسباب کا قلع قمع کرنے پر زور صرف کرے گی جن سے معاشرے میں جرائم اور اخلاقی برائیوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں بے حیائی پھیلانے والی اور عفت و پاکدامنی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی خاندانی منصوبہ بندی کی پوری اسکیم بھی ختم کر دی جائیگی، اور ملک کے وسائل پر روز افزوں آبادی کے دباؤ کا علاج وسائل کو مزید ترقی دینے سے کیا جائے گا۔

اس منشور میں معاشی پالیسی کے بنیادی مقاصد یہ بیان کیے گئے ہیں:

— عادلانہ تقسیم دولت،

— دولت کو چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے سے روکنا،

— ظلم اور ناجائز استحصال کی تمام صورتوں کا خاتمہ،

— تمام لوگوں کے لیے مساوی مواقع کی فراہمی،

— معاشی ترقی کے فوائد سے ملک کے تمام لوگوں کو مستفید ہونے کا موقع دینا۔

- ملک سے غربت کا خاتمہ

—— اور اس امر کی ضمانت کہ بنیادی ضروریاتِ زندگی سے کوئی باشندہ محروم نہ رہے۔ ان مقاصد پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاشی میدان میں جماعت اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ ایک طرف تو پاکستان کے عوام سرمایہ داری اور جاگیرداری کی لعنتوں اور مصائب سے نجات حاصل کر سکیں اور دوسری طرف اشتراکیت کی صورت میں سرمایہ دارانہ آمریت سے بھی محفوظ رہیں۔ انہیں اس میدان میں ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ آزادی کے ساتھ اپنی عزتِ نفس کا سودا کیے بغیر معاشی لحاظ سے اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کریں۔ وہ اگر ایک طرف سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ اور جاگیرداروں کے جبر و استبداد سے مامون ہوں تو دوسری طرف اشتراکیت کی بے حس جکڑ بندیوں سے بھی آزاد رہیں تاکہ حکومت کی غلط پالیسیوں پر بلا خوف و خطر ٹوک سکیں اور اُسے اپنی خواہش کے مطابق تبدیل کر سکیں۔

اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے منشور کے اندر دو واضح پروگرام پائے جاتے ہیں۔

ایک پروگرام میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ دولت کے ارتکاز کو روکا جائے تاکہ ملکی دولت چند ہاتھوں میں سمٹنے نہ پائے اور ملک کی عام آبادی پیدائشِ دولت سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔

دوسرے، ملک کے بے بس اور مفلوک الحال طبقے کی بے بسی کو دور کر کے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ سرمایہ دار طبقے اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کی محنت سے ناجائز انتفاع نہ کر سکیں۔ پسے ہوئے طبقوں کی داد و ستد کی قوت کو بڑھا کر انہیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنے حق کا مطالبہ کر سکیں اور محض اپنی غربت اور افلاس کی وجہ سے اپنے حق سے محروم نہ رہیں۔ معاشی عدل کے قیام کے لیے یہ پروگرام انتہائی ضروری ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے اس منشور میں اُن تمام نئی اور پرانی جاگیرداریوں کو ختم کرنے کا عزم کیا گیا ہے جو کسی دورِ حکومت میں اختیارات کے ناجائز استعمال سے پیدا ہوئی ہوں۔ اسی طرح صنعت و تجارت میں اجارہ داریوں اور کاروباری جتھہ بندیوں کو توڑنے، بڑی بڑی صنعتوں اور تجارتوں کی ملکیت کو عام لوگوں میں پھیلانے کا التزام کیا گیا ہے تاکہ

دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کے بجائے عوام میں بلا روک ٹوک پھیلے اور کوئی طبقہ کسی دوسرے طبقے کے ناجائز تسلط یا دباؤ کی وجہ سے اپنے جائز حقوق سے تہی دست نہ رہے۔ پھر اس منشور میں اس امر کی تصریح بھی کردی گئی ہے کہ سود، سٹہ، جوا، بیوع فاسدہ، ناجائز ذخیرہ اندوزی اور کسب مال کے دوسرے تمام ان طریقوں کو قانوناً منسوخ کر دیا جائے گا جنہیں اسلامی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ دولت حاصل کرنے کے صرف حلال طریقے باقی رہنے دیئے جائیں گے اور اب تک ناجائز اور حرام طریقوں اور ایک فاسد نظام کی غلط بخشیوں سے دولت کا جو انتہائی ظالمانہ ارتکاز ہو چکا ہے اس کے استیصال کے لیے اسلامی اصولوں کے مطابق تمام ان لوگوں کا سختی کے ساتھ محاسبہ کیا جائے گا جن کے پاس دولت کا غیر معمولی اجتماع پایا جاتا ہے اور اس حرام دولت کو واپس لینے کے لیے تمام مناسب انتظامی اور قانونی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

معاشی عدل کے قیام کے لیے یوں تو جماعت نے اور بھی بہت سی تدابیر اپنے منشور میں درج کی ہیں لیکن اگر صرف مندرجہ بالا چند تدابیر کو اختیار کیا جائے تو سرمایہ دارانہ نظام اپنے سارے مفاسد کے ساتھ چند سالوں میں ختم ہو سکتا ہے۔ جاگیرداریوں کے خاتمے سے نہ صرف مزارعین کی ایک بڑی تعداد ظلم و استبداد سے بچائی جا سکتی ہے بلکہ اُسے زمینوں کا مالک بنا کر اس کی معاشی حالت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ پھر جماعت نے قدیم املاک کے معاملے میں عارضی طور پر زمین کی ملکیت کی جو ایک خاص حد مقرر کی ہے اس نے جاگیرداری کا پوری طرح سدِباب کر دیا ہے۔ اسی طرح صنعت و تجارت میں جماعت کی مجوزہ تدابیر بڑے دُور رس نتائج کی حامل ہیں۔ وہ لوگ جو سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقاء اور اس کے مفاسد کی صحیح نوعیت کو جانتے ہیں ان سے یہ بات مخفی نہیں کہ یہ نظام پیدائشِ دولت کے غیر اخلاقی اور غیر انسانی طریقوں کی مدد سے پروان چڑھا ہے۔ اگر کسب مال کے ان سارے راستوں کو بند کر دیا جائے جنہیں شریعتِ اسلامی نے حرام قرار دیا ہے تو اس نظام کی رفیع الشان عمارت خود بخود پیوند خاک ہو جائے گی۔ سرمایہ داری اور حرام خوری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر حرام خوری کو روک دیا جائے تو سرمایہ داری خود دم توڑ دیگی۔

اس ضمن میں جماعت نے معاشی اعتبار سے مفلوک الحال طبقوں کو اٹھانے کے لیے بھی متعدد تدابیر پیش

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

تفہیم القرآن

الملک

(۲)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اُس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق۔[۲۴] اُسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔[۲۶] کیا تم اِس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے[۲۵]۔

[۲۴] یعنی یہ زمین تمہارے لیے آپ سے آپ تابع نہیں بن گئی ہے اور وہ رزق بھی جو تم کھا رہے ہو خود بخود یہاں پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ اللہ نے اپنی حکمت اور قدرت سے اِس کو ایسا بنایا ہے کہ یہاں تمہاری زندگی ممکن ہوئی اور یہ عظیم الشان کرہ ایسا پُرسکون بن گیا کہ تم اطمینان سے اِس پر چل پھر رہے ہو اور اِس میں تمہارے لیے زندگی بسر کرنے کا بے حد و حساب سر و سامان فراہم ہو گیا۔ اگر تم غفلت میں مبتلا نہ ہو اور کچھ ہوش سے کام لے کر دیکھو تو تمہیں معلوم ہو کہ اِس زمین کو تمہاری زندگی کے قابل بنانے اور اِس کے اندر رزق کے اتھاہ خزانے جمع کر دینے میں کتنی حکمتیں کار فرما ہیں۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳-۷۴-۸۱۔ جلد چہارم، یٰس، حواشی ۲۹-۳۲۔ المومن، حواشی ۹۰-۹۱۔ الزُخرُف، حاشیہ ۷۔ الجاثیہ، حاشیہ ۷۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۱۸)۔

[۲۶] یعنی اِس زمین پر چلتے پھرتے اور خدا کا بخشا ہُوا رزق کھاتے ہوئے اس بات کو نہ بھولو کہ آخر کار تمہیں ایک دن خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔

[۲۵] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں رہتا ہے، بلکہ یہ بات اِس لحاظ سے فرمائی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر جب خدا سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ دعا مانگتا ہے تو آسمان کی

تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے ؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے[۲۶] ؟ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی

طرف ہاتھ اٹھاتا ہے۔ کسی آفت کے موقع پر سب سہاروں سے مایوس ہوتا ہے تو آسمان کا رخ کر کے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ کوئی ناگہانی بلا آپڑتی ہے تو کہتا ہے یہ اوپر سے نازل ہوئی ہے۔ غیر معمولی طور پر حاصل ہونے والی چیز کے متعلق کہتا ہے یہ عالمِ بالا سے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کتبِ سماوی یا کتبِ آسمانی کہا جاتا ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص ایک کالی لونڈی کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھ پر ایک مومن غلام آزاد کرنا واجب ہو گیا ہے، کیا میں اس لونڈی کو آزاد کر سکتا ہوں ؟ حضورؐ نے اس لونڈی سے پوچھا اللہ کہاں ہے ؟ اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا۔ حضورؐ نے پوچھا اور میں کون ہوں ؟ اس نے پہلے آپؐ کی طرف اور پھر آسمان کی طرف اشارہ کیا، جس سے اس کا یہ مطلب واضح ہو رہا تھا کہ آپ اللہ کی طرف سے آئے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا، اسے آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے (اسی سے ملتا جلتا قصہ مُوطّا، مسلم اور نسائی میں بھی روایت ہوا ہے)۔ حضرت خولہ بنت ثعلبہ کے متعلق حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے فرمایا، یہ وہ خاتون ہیں جن کی شکایت سات آسمانوں پر سنی گئی (تفسیر سورۂ مجادلہ حاشیہ ۲ میں ہم اس کی تفصیل نقل کر چکے ہیں)۔ ان ساری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات کچھ انسان کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ جب خدا کا تصور کرتا ہے تو اس کا ذہن نیچے زمین کی طرف نہیں بلکہ اوپر آسمان کی طرف جاتا ہے۔ اسی بات کو ملحوظ رکھ کر یہاں اللہ تعالیٰ کے متعلق مَنْ فِي السَّمَاءِ (وہ جو آسمان میں ہے) کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ اس میں اس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کو آسمان میں مقیم قرار دیتا ہے۔ یہ شبہ آخر کیسے پیدا ہو سکتا ہے جبکہ اسی سورۂ ملک کے آغاز میں فرمایا جا چکا ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (جس نے تہ بر تہ سات آسمان پیدا کیے) اور سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (پس تم جدھر بھی رخ کرو اُس طرف اللہ کا رخ ہے)۔

[۲۶] مراد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اس زمین پر تمہارا بقا اور تمہاری سلامتی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے۔ اپنے بل بوتے پر تم یہاں مزے سے نہیں دندنا رہے ہو۔ تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ جو یہاں

ہے۲۷۔ اِن سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ پھر دیکھ لو کہ میری گرفت کیسی سخت تھی۲۸۔ کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو۲۹۔ وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۳۰۔ بتاؤ، آخر وہ کون سا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمان کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے۳۱؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ یا پھر بتاؤ، کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے اگر رحمان اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں۔ بھلا سوچو، جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو۳۲ وہ زیادہ صحیح

گزر رہا ہے، اللہ کی حفاظت اور نگہبانی کا رہینِ منت ہے۔ ورنہ کسی وقت بھی اس کے ایک اشارے سے ایک زلزلہ ایسا آسکتا ہے کہ یہی زمین تمہارے لیے آغوشِ مادر کے بجائے قبر کا گڑھا بن جائے، یا ہوا کا ایسا طوفان آسکتا ہے جو تمہاری بستیوں کو غارت کر کے رکھ دے۔

۲۷ تنبیہ سے مراد وہ تنبیہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کے ذریعہ سے کفارِ مکہ کو کی جا رہی تھی کہ اگر کفر و شرک سے باز نہ آؤ گے اور اُس دعوتِ توحید کو نہ مانو گے جو تمہیں دی جا رہی ہے تو خدا کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

۲۸ اشارہ ہے اُن قوموں کی طرف جو اپنے ہاں آنے والے انبیاء کو جھٹلا کر اس سے پہلے مبتلائے عذاب ہو چکی تھیں۔

۲۹ یعنی ایک ایک پرندہ جو ہوا میں اڑ رہا ہے، خدائے رحمٰن کی حفاظت میں اڑ رہا ہے۔ اُسی نے ہر پرندے کو وہ ساخت عطا فرمائی جس سے وہ اڑنے کے قابل ہوا۔ اسی نے ہر پرندے کو اڑنے کا طریقہ سکھایا۔ اُسی نے ہوا کو اُن قوانین کا پابند کیا جن کی بدولت ہوا سے زیادہ بھاری جسم رکھنے والی چیزوں کا اُس میں اڑنا ممکن ہوا۔ اور وہی ہر اڑنے والے کو فضا میں تھامے ہوئے ہے، ورنہ جس وقت بھی اللہ اپنی حفاظت اُس سے ہٹا لے، وہ زمین پر آ رہے۔

۳۰ یعنی کچھ پرندوں ہی پر موقوف نہیں، جو چیز بھی دنیا میں موجود ہے اللہ کی نگہبانی کی بدولت موجود ہے۔ وہی ہر شے کے لیے وہ اسباب فراہم کر رہا ہے جو اس کے وجود کے لیے درکار ہیں، اور وہی اس بات کی نگرانی

راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو؟ ان سے کہو اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیئے، مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔

کر رہا ہے کہ اس کی پیدا کردہ ہر مخلوق کو اس کی ضروریات بہم پہنچیں۔

۳۱ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "رحمان کے سوا وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بنا ہوا تمہاری دستگیری کرتا ہو" ہم نے متن میں جو ترجمہ کیا ہے وہ آگے کے فقرے سے مناسبت رکھتا ہے، اور اس دوسرے ترجمہ کی مناسبت اوپر کے سلسلۂ کلام سے ہے۔

۳۲ یعنی جانوروں کی طرح منہ نیچا کیے ہوئے اسی ڈگر پر چلا جا رہا ہو جس پر کسی نے اسے ڈال دیا ہو۔

۳۳ یعنی اللہ نے تو تمہیں انسان بنایا تھا، جانور نہیں بنایا تھا۔ تمہارا کام یہ نہیں تھا کہ جو گمراہی بھی دنیا میں پھیلی ہوئی ہو اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چل پڑو اور کچھ نہ سوچو کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ کان تمہیں اس لیے تو نہیں دیئے گئے تھے کہ جو شخص تمہیں صحیح اور غلط کا فرق سمجھانے کی کوشش کرے اس کی بات سُن کر نہ دو اور جو غلط سلط باتیں پہلے سے تمہارے دماغ میں بیٹھی ہوئی ہیں اُنہی پر اڑے رہو۔ یہ آنکھیں تمہیں اس لیے تو نہیں دی گئی تھیں کہ اندھے بن کر دوسروں کی پیروی کرتے رہو اور خود اپنی بینائی سے کام لے کر یہ نہ دیکھو کہ زمین سے آسمان تک ہر طرف جو نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ آیا اُس توحید کی شہادت دے رہی ہیں جسے خدا کا رسول پیش کر رہا ہے یا یہ شہادت دے رہی ہیں کہ یہ سارا نظامِ کائنات بے خدا ہے یا بہت سے خدا اِس کو چلا رہے ہیں۔ اِسی طرح یہ دل و دماغ بھی تمہیں اس لیے نہیں دیئے گئے تھے کہ تم سوچنے سمجھنے کا کام دوسروں کے حوالے کر کے ہر اُس طریقے کی پیروی کرنے لگو جو دنیا میں کسی نے جاری کر دیا ہے اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سوچنے کی کوئی زحمت گوارا نہ کرو کہ وہ غلط ہے یا صحیح۔ اللہ نے علم و عقل اور سماعت و بینائی کی یہ نعمتیں تمہیں حق شناسی کے لیے دی تھیں۔ تم ناشکری کر رہے ہو کہ اِن سے اور سارے کام تو لیتے ہو مگر بس وہی ایک کام نہیں لیتے جس کے لیے یہ دی گئی تھیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۷۲۔ ۷۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۷۵۔ ۷۶۔ جلد چہارم، السجدہ، حواشی ۱۷۔ ۱۸۔ الاحقاف، حاشیہ ۳۱)۔

اِن سے کہو، اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔[۳۴] یہ کہتے ہیں "اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟"[۳۵] کہو "اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے، میں تو بس صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"[۳۶]۔ پھر جب یہ اس چیز کو قریب دیکھ لیں گے تو اُن سب لوگوں کے چہرے

[۳۴] یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے ہر گوشۂ زمین سے گھیر لاتے جاؤ گے اور اس کے سامنے حاضر کر دیئے جاؤ گے۔

[۳۵] یہ سوال اس غرض کے لیے نہ تھا کہ وہ قیامت کا وقت اور اس کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے اور اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر انہیں اُس کی آمد کا سال، مہینہ، دن اور وقت بتا دیا جاتے تو وہ اسے مان لیں گے۔ بلکہ دراصل وہ اس کے آنے کو غیر ممکن اور بعید از عقل سمجھتے تھے اور یہ سوال اس غرض کے لیے کرتے تھے کہ اسے جھٹلانے کا ایک بہانہ اُن کے ہاتھ آئے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ حشر و نشر کا یہ عجیب و غریب افسانہ جو تم ہمیں سنا رہے ہو آخر یہ کب ظہور میں آئے گا؟ اسے کس وقت کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے؟ ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر اسے دکھا کیوں نہیں دیتے کہ ہمیں اس کا یقین آجائے؟ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی شخص اگر قیامت کا قائل ہو سکتا ہے تو عقلی دلائل سے ہو سکتا ہے، اور قرآن میں جگہ جگہ وہ دلائل تفصیل کے ساتھ دے دیئے گئے ہیں۔ رہی اُس کی تاریخ، تو قیامت کی بحث میں اُس کا سوال اٹھانا ایک جاہل آدمی ہی کا کام ہے۔ کیونکہ اگر بالفرض وہ بتا بھی دی جاتے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ ماننے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ جب وہ تمہاری بتائی ہوئی تاریخ پر آجاتے گی تو مان لوں گا، آج آخر میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ اُس روز ضرور آجائے گی۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۶۳۔ الاحزاب، حاشیہ ۱۱۶۔ سبا، حواشی ۵-۴۸۔ یٰس، حاشیہ ۴۵)۔

[۳۶] یعنی یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ ضرور آئے گی، اور لوگوں کو اس کی آمد سے پہلے خبردار کر دینے کے لیے یہی جاننا کافی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ کب آئے گی، تو اس کا علم اللہ کو ہے، مجھے نہیں ہے، اور خبردار کرنے کے لیے اس علم کی کوئی حاجت نہیں۔ اس معاملہ کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بات کہ کون شخص کب مرے گا، اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ یہ ہمیں معلوم ہے کہ ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔ ہمارا یہ علم اِس بات کے لیے کافی ہے کہ ہم اپنے کسی غیر محتاط دوست کو یہ تنبیہ کریں کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے مفاد کی حفاظت کا انتظام

بگڑ جائیں گے جنہوں نے انکار کیا ہے[۳۷]، اور اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم تقاضے کر رہے تھے۔

اِن سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اللہ خواہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے، کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچالے گا؟[۳۸] اِن سے کہو، وہ بڑا رحیم ہے، اُسی پر ہم ایمان لائے ہیں، اور اُسی پر ہمارا بھروسا ہے[۳۹]۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے۔ اِن سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اُتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لا دے گا؟[۴۰]

کرلے۔ اس تنبیہ کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ وہ کس روز مرے گا۔

[۳۷] یعنی ان کا وہی حال ہوگا جو پھانسی کے تختہ کی طرف لے جائے جانے والے کسی مجرم کا ہوتا ہے۔

[۳۸] مکہ معظمہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا آغاز ہوا اور قریش کے مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تو گھر گھر حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں کو بد دعائیں دی جانے لگیں۔ جادو ٹونے کیے جانے لگے تاکہ آپ ہلاک ہو جائیں۔ حتیٰ کہ قتل کے منصوبے بھی سوچے جانے لگے۔ اس پر یہ فرمایا گیا کہ ان سے کہو، خواہ ہم ہلاک ہوں یا خدا کے فضل سے زندہ رہیں، اس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ تم اپنی فکر کرو کہ خدا کے عذاب سے تم کیسے بچو گے۔

[۳۹] یعنی ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور تم اس سے انکار کر رہے ہو، ہمارا بھروسا خدا پر ہے اور تمہارا اپنے جتھوں اور اپنے وسائل اور اپنے معبودانِ غیر اللہ پر۔ اس لیے خدا کی رحمت کے مستحق ہم ہو سکتے ہیں نہ کہ تم۔

[۴۰] یعنی کیا خدا کے سوا کسی میں یہ طاقت ہے کہ ان سوتوں کو پھر سے جاری کر دے؟ اگر نہیں ہے، اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے، تو پھر عبادت کا مستحق خدا ہے، یا تمہارے وہ معبود جو انہیں جاری کرنے کی کوئی قدرت نہیں رکھتے؟ اس کے بعد تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ گمراہ خدائے واحد کو ماننے والے ہیں یا وہ جو شرک کر رہے ہیں؟

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

ملک غلام علی صاحب

(۹)

بحث سابق میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین میں سے کسی بزرگ نے بھی اپنے کسی عزیز یا قرابت دار کے حق میں جانشینی کی تجویز امت کے لیے پیش نہیں فرمائی۔ یہ بات بھی صاف کی جا چکی ہے کہ عبادات و تقربات، یا پھر وہ معاملات جو مشروع طریق پر سرانجام پائیں، ان میں تو نیت کے وجود و فقدان اور نیت کی صحت و عدمِ صحت کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے، لیکن جو امور تعبدی نہیں ہیں اور جن کا مشروع و مسنون ہونا ثابت نہیں، ان میں نیت کے غلط یا صحیح ہونے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ ان میں خواہ صحیح جذبہ یا نیت کارفرما ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ ذاتی مفاد کے لیے ہوں یا قومی مفاد کے لیے، ان سے اختلاف کرنے یا انہیں غلط قرار دینے کا حق کسی طرح سلب نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کے افعال پر امت کے علماء و صلحاء ہمیشہ گرفت کرتے چلے آتے ہیں اور ضمناً ان کے جذبات و محرکات بھی زیر بحث آتے رہے ہیں۔ اس چیز کو نیت پر حملہ یا سوئے ظن کا نام دے کر اسے مذموم یا ممنوع قرار دینا درست نہیں۔ نیت پر حملہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کسی عبادت یا نیکی کے کام کو بھی بلاوجہ بُری نیت پر مبنی سمجھ لیا جاتے، ورنہ غلط کام بہرحال غلط ہے قطع نظر اس سے کہ وہ اچھے جذبے یا اچھی نیت سے کیا جاتے یا نہ کیا جاتے۔

<u>یزید کی ولی عہدی کے متعلق عثمانی صاحب کا بدلتا ہوا موقف</u> اب یزید کی ولی عہدی کے متعلق مدیر البلاغ فرماتے ہیں کہ "جہاں تک اس مسئلے کا تعلق ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یزید کو ولی عہد بنانا رائے، تدبیر اور نتائج کے اعتبار سے صحیح تھا یا غلط، اس میں ہمیں مولانا مودودی صاحب سے اختلاف نہیں ہے۔ جمہور امت کے محقق علماء

ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا۔" یہ جہاں اتنی بات تو ان کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ فعل رائے، تدبیر اور نتائج کے اعتبار سے صحیح نہ تھا اور امت کے اجتماعی مفادات کے منافی تھا۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ "مولانا سے ہمارا اختلاف اس مسئلے میں ہے کہ مولانا نے اس اقدام کو محض رائے اور تدبیر کے اعتبار سے غلط قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ براہِ راست حضرت معاویہؓ کی نیت پر تہمت لگا کر اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ ان کے پیشِ نظر بس اپنا ذاتی مفاد تھا اور اس پر انہوں نے پوری امت کو قربان کر دیا۔" مدیر موصوف کے اس دوسرے معارضے کا جواب میں اب تک کی بحث میں دے چکا ہوں۔ میرے لیے دوبارہ بس اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اگرچہ مولانا نے نیت پر تہمت نہیں لگائی لیکن یہ امر جب تسلیم شدہ ہے کہ امیر معاویہؓ کا فعل رائے، تدبیر اور نتائج تینوں لحاظ سے غلط تھا اور مصالح اجتماعیہ کے حق میں نقصان رساں ثابت ہوا تو پھر جذبے یا نیت کے صحیح ہونے نہ ہونے یا ذاتی مفاد پر مبنی ہونے نہ ہونے سے عملاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ پھر مولانا مودودی نے جو بات کہی تھی وہ دراصل یہ تھی کہ "انہوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح امت محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔" ان الفاظ کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ انہوں نے جانتے بوجھتے امت کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کر دیا، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ اس فعل کے نتیجے میں امت خلافت کے بجائے ملوکیت و آمریت اور نسلی بادشاہت کی راہ پر پڑ گئی اور یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔ کیا آپ خود جمہور محققین کا قول یہی بیان نہیں فرما رہے کہ یہ فعل درست نہ تھا بلکہ نقصان دہ ثابت ہوا؟

اس کے بعد عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ "ہماری آئندہ گفتگو کا حاصل یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ اقدام واقعے کے اعتبار سے سو فی صد درست اور نفس الامر میں بالکل صحیح تھا یا انہوں نے جو کچھ کیا وہ بالکل ٹھیک کیا۔" ان الفاظ سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا عثمانی نے اپنے سابق موقف میں ترمیم کر کے اب یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ اقدام صد فی صد درست یا بالکل ٹھیک نہیں، حالانکہ وہ پہلے اسے بلا تخصیص اور

علی الاطلاق نادرست قرار دے چکے ہیں، بلکہ جمہوریت کا مسلک ہی بنا چکے ہیں۔

پھر آگے چل کر انہوں نے جو بحث کی ہے، اس میں وہ اس فی صد والے موقف سے بھی تدریج دور ہٹتے چلے گئے ہیں، حتیٰ کہ آخر میں فرماتے ہیں کہ "اگر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیانت داری سے یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے، تو اُسے ولی عہد بنا دینا شرعی اعتبار سے بالکل جائز تھا"۔ مزید فرماتے ہیں کہ "یزید کی جو مکروہ تصویر ذہنوں میں بسی ہوئی ہے، اس کی بنیادی وجہ کربلا کا حادثہ ہے۔ لیکن جس وقت اُسے ولی عہد بنایا جا رہا تھا، اس وقت یزید کی شہرت جھوٹوں کو بھی اِس حیثیت سے نہیں تھی جیسی آج ہے۔ اُس وقت تو وہ ایک صحابی اور ایک خلیفۂ وقت کا صاحبزادہ تھا۔ اس کے ظاہری حالات، صوم و صلوٰۃ کی پابندی، اس کی دنیوی نجابت اور اس کی انتظامی صلاحیت کی بنا پر یہ رائے قائم کرنے کی پوری گنجائش تھی کہ وہ خلافت کا اہل تھا"۔

ولی عہدی کا جواز و عدم جواز یزید کے فضائل و مناقب بالتفصیل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مدیر البلاغ نے ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت پر بھی بحث کی ہے جس کے ضروری اجزاء اہمیت کے پیش نظر اب میں نقل کرتا ہوں اور ان کے متعلق اپنے معروضات بھی پیش کرتا ہوں۔ مولانا عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ "اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفۂ وقت اگر کسی شخص میں نیک نیتی کے ساتھ شرائطِ خلافت پاتا ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کو ولی عہد بنا دے، خواہ وہ اس کا باپ، بیٹا یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ازالۃ الخفا جلد اول ص۵"۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا مسلک عثمانی صاحب کے اس حوالے کے بعد ازالۃ الخفاء سے میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی متعلقہ بحث درج کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے پہلے تو دس "شروطِ خلافت" بیان کی ہیں جو انعقادِ خلافت کے لیے ضروری ہیں، مثلاً خلیفہ کا مسلمان، عاقل، بالغ ہونا وغیرہ۔ انہی میں آٹھویں شرط انہوں نے عدالت بیان فرمائی ہے اور اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

مجتنب از کبائر، غیر مُصر بر صغائر و صاحب مروت باشد۔ نہ ہرزہ گرد و خلیع العذار۔	کبیرہ گناہوں سے بچنے والا اور صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنے والا نہ ہو۔ ذی مروت ہو نہ کہ ہرزہ گرد اور وارستہ مزاج۔

پھر فرماتے ہیں کہ "جب یہ سب شرطیں کسی شخص میں پائی جائیں تو وہ مستحقِ خلافت سمجھا جائے گا اور اگر لوگ اُسے خلیفہ بنائیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں، تو وہ خلیفۂ راشد ہوگا۔ مزید لکھتے ہیں:

غیر مستجمع ایں شروط را اگر خلیفہ سازند، ساعیان خلافتش در عاصی گردند لیکن اگر تسلط یابد حکم او فیما یوافق الشرع نافذ باشد برائے ضرورت کہ برداشتن او از مسند خلافت اختلاف امت پیدا کند و ہرج و مرج پدید آرد۔

اور اگر لوگ کسی ایسے شخص کو خلیفہ بنائیں جس میں یہ تمام شرائط جمع نہ ہوں تو اس کی خلافت کے بانی گنہ گار ہوں گے لیکن اگر وہ تسلط پالے تو اس کا حکم جو موافقِ شرع ہو، نافذ ہوگا ضرورت کی بنا پر۔ کیونکہ تسلط کے بعد اُسے مسندِ خلافت سے ہٹانا اختلافِ امت کا باعث ہوتا ہے اور انتشار اور بدنظمی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب انعقادِ خلافت کے چار طریقے بیان فرماتے ہیں۔ پہلا طریقہ ان کے نزدیک اہلِ حل و عقد کا انتخاب ہے، یعنی مملکت کے عالم، قاضی اور نامور لوگ بیعت کریں۔ اس سلسلے میں وہ حضرت عمرؓ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ جس نے مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر بیعت کی اور جس نے لی، ان کی کوئی بیعت نہیں بلکہ وہ دونوں سزاوارِ قتل ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پہلے طریق پر منعقد ہوئی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خلیفہ کسی شخص کو مسلمانوں کی خیر خواہی کو سامنے رکھ کر بطور جانشین تجویز کر دے جو شروطِ خلافت کا جامع ہو اور لوگوں کو جمع کرنے کے بعد ان کے سامنے اس کا اعلان کر دے۔ حضرت عمرؓ فاروق کی خلافت اسی طرح منعقد ہوئی۔ تیسرا طریقہ مجلسِ شوریٰ کا قیام ہے اور وہ یوں ہے کہ خلیفہ ایک ایسی جماعت میں امرِ خلافت دائر کر دے جس جماعت کے سب ارکان شروطِ خلافت پر پورے اُترتے ہوں۔ یہ مجلسِ شوریٰ خلیفہ کی وفات کے بعد مشورہ کرے اور ایک شخص کو خلیفہ معین کرلے۔ حضرت عثمانؓ ذوالنورین کا انتخاب اسی طریق پر ہوا۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد اس مجلس کا اجلاس ہوا اور خلیفۂ ثالث نامزد ہوئے۔

انتخاب خلیفہ کے یہ تین طریقے جو خلفائے راشدین کے عہد میں اختیار کیے گئے، انہیں بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک چوتھا طریقہ حصولِ خلافت کا "استیلاء" (یعنی زبردستی غلبہ و تسلط حاصل کرنا) ہے۔ اس کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں:

چوں خلیفہ بمیرد و شخصے متصدی خلافت گردد بغیر بیعت و استخلاف ہمہ را برخود جمع سازد یا تیلافِ قلوب یا بقہر و نصبِ قتال خلیفہ شود و لازم گردد بر مردماں اتباعِ فرمانِ او در آنچہ موافق شرع باشد۔ و ایں دو نوع است یکے آنکہ مستولی مستجمع شروط باشد و صرف منازعین کند بصلح و تدبیر از غیر ارتکاب محرمے و ایں قسم جائز است در رخصت و انعقادِ خلافتِ معاویہ ابن ابی سفیان بعد حضرت مرتضیٰ و بعد صلح امام حسن ہمیں نوع بود۔ دیگر آنکہ مستجمع شروط نباشد و صرف منازعین کند بقتال و ارتکابِ محرم و آں جائز نیست و فاعل آں عاصی است لیکن واجب است قبولِ احکامِ او چوں موافق شرع باشد . . . و ایں انعقاد بنا بر ضرورت است۔

جب خلیفہ فوت ہو جائے تو کوئی شخص خلافت پر قابض یا فتنہ ہو جائے اور بیعت و استخلاف کے بغیر تالیف قلب سے یا بزور شمشیر لوگوں کو اپنا مطیع بنا لے تو یہ شخص خلیفہ بن جائے گا اور اس کے موافق شرع احکام کی پیروی لوگوں پر لازم ہو جائے گی۔ اس استیلائی خلافت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ قوت سے قبضہ پانے والے کے اندر خلافت کی تمام شرطیں پائی جائیں اور وہ صلح و تدبیر کے ذریعے سے کسی ناجائز امر شرعی کا ارتکاب کیے بغیر مدعیانِ خلافت کو راستے سے ہٹا دے۔ یہ صورت بھی بطور رخصت و ضرورت جائز ہے۔ اور حضرت علیؓ مرتضیٰ کی وفات اور امام حسنؓ کی صلح کے بعد معاویہؓ کی خلافت کا انعقاد اسی قسم کا تھا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ شخص متغلب کے اندر شرائطِ خلافت جمع نہ ہوں اور وہ قتال اور ارتکاب حرام کے ذریعے سے مخالفین کا دفعیہ کرے اور یہ صورت جائز نہیں ہے اور اس کا فاعل گنہ گار ہے۔ لیکن اس کے موافقِ شرع احکام کی تعمیل بھی واجب ہے اور انعقادِ خلافت کی اس شکل کا جواز بھی بربنائے ضرورت ہے۔

استیلائی یا متغلبانہ خلافت کی دوسری قسم جو شاہ صاحب نے آخر میں بیان کی ہے، اس کے متعلق وہ بعد میں فرماتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان اور اول خلفاء بنی عباس کا انعقادِ خلافت اسی قسم کا تھا۔ حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق شاہ صاحب نے دو قول نقل کیے ہیں۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ مہاجرین و انصارِ مدینہ کے بیعت کر لینے سے حضرت علیؓ کی خلافت منعقد ہو گئی تھی اور حضرت علیؓ نے جو خطوط اہلِ شام کو طلب بیعت کے سلسلے میں لکھے تھے، وہ اس پر شاہد ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خلافت علیؓ کا انعقاد بذریعہ شوریٰ اسی وقت ہو گیا تھا جبکہ

حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد ان کا نام حضرت عثمانؓ کے ساتھ تجویز ہوا تھا، لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

اب شاہ ولی اللہ صاحب کی اس بحث میں جو امر قابلِ ملاحظہ ہے، وہ یہ کہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے لے کر امیر معاویہؓ، عبدالملک، بنو عباس وغیرہ سب کا ذکر ان چار طریقہ ہائے انعقادِ خلافت کے تحت کر دیا ہے مگر یزید کی ولایتِ عہد یا خلافت کا ذکر انہوں نے بالکل نہیں فرمایا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ لیا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے انتقال یا ایامِ مرض سے بہت پہلے جس طرح اپنے بیٹے کو ولی عہد بنایا اور اس کے لیے بیعت لی، یہ کارروائی بالکل ناجائز تھی اور خلافتِ یزید کے انعقاد کے لیے کوئی صحیح اور جائز بنیاد نہیں بن سکتی تھی یہی وجہ ہے کہ حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے ولی عہدی کی بیعت سے انکار فرمایا اور حضرت عبداللہؓ ابن عمر جیسے محتاط متقی اور مصالحت پسند بزرگ نے بھی یہ کہہ دیا کہ میں بیک وقت دو بیعتوں کا قلادہ اپنی گردن میں نہیں ڈال سکتا بلکہ امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد جب ولید گورنر مدینہ نے اصرار کیا تو آپ برابر ٹالتے رہے اور کہتے رہے کہ جب دوسرے سب لوگ یزید کی بیعت کریں گے تو میں بھی کر لوں گا۔ تاہم اگر مدیرِ "البلاغ" یا کوئی دوسرے ان کے ہم خیال یہ کہیں کہ ولایتِ عہد کے لیے بیعتِ عام حاصل کر کے لوگوں کو اس عہد کا پابند بنانا صحیح ہے اور یہ انعقادِ خلافت کے حق میں ایک جائز دلیل و بنیاد بن سکتی ہے، تب بھی یزید کے حق میں ولایتِ عہد کی کارروائی شاہ صاحب کے بیان کردہ چوتھے طریقے، یعنی خلافت بذریعۂ تغلب و استیلاء ہی کے تحت آسکتی ہے، کیونکہ خود حضرت معاویہؓ کی خلافت کو بھی شاہ صاحب اسی چوتھے طریق کا حاصل قرار دے رہے ہیں اور اسے محض ضرورت و رخصت کی بنا پر جائز کہہ رہے ہیں۔ پھر انعقادِ خلافت کے اس آخری طریق کی بھی انہوں نے دو قسمیں بیان کی ہیں جن میں دوسری یہ ہے کہ جو شخص زبردستی خلافت پر قابض ہو رہا ہے، اس میں جملہ شرائطِ خلافت موجود نہ ہوں اور وہ بذریعۂ قتال منازعین کا صفایا کر دے۔ یہ صورت شاہ صاحبؒ کے نزدیک ناجائز اور اس کا فاعل عاصی ہے۔ اب اس کے بعد قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ شاہ صاحب کی یہ بحث کس حد تک یزید کی ولایتِ عہد کی تائید و تصویب کرتی ہے اور اُسے انعقادِ خلافت کا جائز و مستحسن طریقہ قرار دیتی ہے۔ کیا شاہ صاحب کی مراد یہ ہو سکتی ہے کہ خلفائے راشدین جس طرح منتخب ہوتے اور بنو امیہ و بنو عباس جس طرح سریرِ خلافت پر مستولی و متسلط ہوئے، یہ

سب طریقے یکساں طور پر معیاری یا پسندیدہ تھے؟ میں نہیں سمجھ سکا کہ مولانا عثمانی صاحب نے ازالۃ الخفا کے اس مقام کا حوالہ کس مناسبت سے دیا ہے۔

امام ماوردی کا مسلک دوسرا حوالہ مولانا عثمانی صاحب نے الاحکام السلطانیہ للماوردی ص۸ کا دیا ہے۔ اس مقام پر امام ماوردی نے شروع میں بلاشبہ یہ رائے ظاہر کی ہے ایک خلیفہ کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنا جانشین تجویز کر دے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو کر دیا تھا اور مسلمانوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا، لیکن یہ ایک اصولی اور تمہیدی بات ہے جو انہوں نے کہی ہے۔ اس سے آگے جو کچھ وہ فرماتے ہیں وہ درج ذیل ہے:

فاذا اراد الامام ان یعهد بها فعلیه ان یجهد رأیه فی الاحق بها والاقوم بشروطها فاذا تعین له الاجتهاد فی واحد نظر فیه فان لم یکن ولدا ولا والدا جاز ان ینفرد بعقد البیعة له وبتفویض العهد الیه وان لم یستشر فیه احدا من اهل الاختیار۔	جب امام کا ارادہ یہ ہو کہ وہ ولی عہد مقرر کرے تو وہ پوری طرح غور و فکر کرے کہ کون شخص امامت کا سب سے زیادہ مستحق اور شرائطِ خلافت پر سب سے زیادہ پورا اُترنے والا ہے۔ اپنے ذہن و فہم کی پوری جدوجہد کے بعد جب اس کی رائے ایک شخص پر جم جائے تو دیکھے کہ وہ کون ہے۔ اگر وہ اس کا بیٹا یا والد نہ ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ تنہا اپنی مرضی سے اُسے ولی عہد بنائے خواہ اس نے انتخاب کنندگان سے مشورہ نہ لیا ہو۔

یہاں اوّلین امر جو قابلِ ملاحظہ ہے وہ یہ ہے کہ امام ماوردی کے نزدیک ولایتِ عہد کی تجویز صرف اس شخص کے حق میں ہو سکتی ہے جو خلافت کے لیے موزوں ترین فرد ہو اور جو شروطِ امامت کو سب سے زیادہ پورا کرنے والا ہو۔ یہ بات عثمانی صاحب نے بالکل غلط لکھی ہے اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور امام ماوردی کی جانب قطعاً غلط منسوب کی ہے کہ "اس پر اجماعِ امت منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفۂ وقت اگر کسی میں نیک نیتی کے ساتھ شرائطِ خلافت پاتا ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کو ولی عہد بنا دے، خواہ وہ اس کا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو"۔ ولی عہد میں محض شرائطِ خلافت کا پایا جانا کافی نہیں ہے (اگرچہ یزید ان کا بھی جامع نہ تھا)، بلکہ جانشینی کا حقدار بننے کے لیے امام ماوردی کے نزدیک یہ بھی لازم ہے کہ وہ شروطِ خلافت میں اَحق و اَقوم ہو۔ امام ماوردی یہ

شرائط (عدالت، علم اور اجتہاد وغیرہ) پہلے بیان کر چکے ہیں نیز یہ بھی بتا چکے ہیں کہ انعقادِ خلافت کا اولین طریقہ "اختیار" یعنی انتخاب ہے۔

بہرکیف اس بات پر اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں کہ خلیفۂ وقت اگر بیٹے یا کسی رشتہ دار میں شرائطِ خلافت پاتا ہے تو اسے ولی عہد بنا دے۔ خود امام ماوردی نے اس جگہ تین مسلک بیان کیے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ جب تک خلیفہ اہل الاختیار (ELECTORS) سے مشورہ نہ کرلے اور وہ ولی عہد کو اہل نہ قرار دیں، اس وقت تک خلیفہ اپنے طور پر ولی عہد نہیں بنا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے خلیفہ کا کسی کو ولی عہد بنانا درحقیقت ولی عہد کے حق میں "تزکیہ" (TESTIMONY) یا دوسرے لفظوں میں شہادت (EVIDENCE) ہے اور یہ امت کے لیے ایک طرح حکم (فیصلہ) کا درجہ رکھتی ہے اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے والد یا بیٹے کے حق میں شہادت دے یا ان دونوں کے حق میں کوئی فیصلہ دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ بیٹا دونوں ایک دوسرے کے حق میں ایک جبلّی میلان رکھتے ہیں اور ان کی باہمی ولایتِ عہد تہمت کا باعث ہے۔ دوسرا مسلک انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ بیٹے اور باپ کے لیے بھی ایک دوسرے کو ولی عہد بنانا جائز ہے، کیونکہ امیر کا امر امت پر نافذ ہے اور حکمِ منصب حکمِ نسب پر غالب ہے (لیکن اس مسلک کی کمزوری بالکل واضح ہے بیٹے کے لیے منصب تجویز کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو منصب کے لیے پیش کرنا اور دونوں میں موجبِ تہمت ہونے کے لحاظ سے فرق نہیں)۔ تیسرا مسلک امام ماوردی کے نزدیک یہ ہے کہ خلیفہ اپنی مرضی سے والد کو تو ولی عہد بنا سکتا ہے مگر بیٹے کو نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ انسان کا طبعی میلان والد کے بجائے اولاد کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور وہ بالعموم یہی چاہتا ہے کہ اپنا مال و منال بیٹے ہی کے لیے محفوظ کرلے۔

امام ماوردیؒ کی پوری بحث کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی تحقیق جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انعقادِ خلافت کا اولین طریقہ انتخاب اور بیعتِ عام ہے۔ ولایتِ عہد کے لیے دو شرطیں لازم ہیں۔ پہلی یہ کہ خلیفۂ وقت پوری امت پر نظر ڈالے اور جو شخص شروطِ خلافت کے اعلیٰ ترین مرتبے پر فائز ہو اور اس کا سب سے زیادہ حقدار ہو، اس کو ولی عہد بنائے۔ دوسری شرط جو صرف بعض علماء نے نہیں بلکہ اکثریت نے لگائی ہے وہ یہ کہ بیٹے کے حق میں ولایتِ عہد اس وقت تک جائز نہیں جب تک اہلِ اختیار یا اہلِ شوریٰ سے مشورہ نہ لے لیا جائے اور وہ بھی یہ امر تسلیم نہ کرلیں کہ بیٹا شروط و صفاتِ امامت میں پوری امت پر فائق اور

خلافت کے لیے سب سے زیادہ مستحق ہے۔

قاضی ابو یعلیٰ کا مسلک اس کے بعد عثمانی صاحب نے قاضی ابو یعلیٰ کی الاحکام السلطانیہ ص۹ کی عبارت نقل کی ہے جس میں باپ اور بیٹے کی ولی عہدی کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ خلیفہ کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنائے جو اس کے ساتھ باپ یا بیٹے کا رشتہ رکھتا ہو، بشرطیکہ وہ خلافت کی شرائط کا حامل ہو۔" مگر خلافت کی شرائط (صفاۃ الائمہ) جسے ابو یعلیٰ نے مسلک پر بیان کیا ہے، انہیں مدیر "البلاغ" نے نقل نہیں کیا۔ ان میں قرشیت، عدالت وغیرہ کے ساتھ چوتھی صفت افضلھم فی العلم والدین ہے، یعنی ولی عہد کو علم و دین میں امت کا افضل ترین شخص ہونا چاہیے۔ یہ وہی بات ہے جو الماوردی نے دوسرے الفاظ میں بیان کی ہے۔ معلوم نہیں دونوں مرتبہ یہ بات عثمانی صاحب سے نقل کرتے وقت کیسے چھوٹ گئی؟ اگر وہ اسے نیت پر حملہ نہ سمجھ بیٹھیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ غالباً یہ اس وجہ سے ہوا کہ یزید جیسے بیٹے کو الاحق بالامامۃ، الاقوم لشروطہا اور افضل فی العلم والدین تسلیم کر لینے میں شاید انہیں بھی کچھ تامل ہو۔ یزید علیہ ما علیہ کو اس اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز کر دینا بڑے دل گردے کا کام ہے اور یہ محمود عباسی جیسے لوگوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ تاہم یہی بات کیا کم ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور خلافت کے انعقاد کو بالکل جائز اور صحیح ثابت کرنے کے لیے عثمانی صاحب نے یزید کی شہرت و سیرت کو، جو واقعہ کربلا کی وجہ سے داغدار ہو گئی تھی، اور جھوٹ سچ جو دھبے اس پر لگ گئے تھے انہیں صاف کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اللہ بھرپور جزا دے۔

ابن خلدون کا موقف یزید کی ولی عہدی کو جائز ثابت کرنے کے لیے ازالۃ الخفاء اور الاحکام السلطانیہ کے علاوہ مولانا محمد تقی صاحب نے مقدمہ ابن خلدون ص ۲۷۶۔۲۷۷، دار الکتاب اللبنانی، بیروت کا حوالہ بھی دیا ہے۔ میں اس سلسلہ بحث کے آغاز ہی میں بیان کر چکا ہوں کہ علامہ ابن خلدون نے امامت و خلافت، انقلاب الخلافۃ الی الملک (خلافت کی ملوکیت میں تبدیلی)، اور بیعت و ولایت عہد وغیرہ موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کے متعدد پہلو محلِ نظر ہیں۔ تاہم ولی عہدی کے مسئلے پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ مذکورہ بالا اقوال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے اور اس سے بھی یہ دعویٰ صحیح ثابت نہیں ہوتا کہ اس بات پر اجماع

منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفۂ وقت اگر بیٹے یا کسی رشتہ دار میں اپنے خیال کے مطابق شرائطِ خلافت پاتا ہے تو اُسے ولی عہد بنا سکتا ہے۔ ابن خلدون فرماتے ہیں: ولا یتّہم الامامُ فی ھذا الامر وان عہدَ الی ابیہ او ابنہ لانہ مامون علی النظر لھم فی حیاتہ فاولی ان لا یحتمل فیھا تبعۃ بعد مماتہ خلافا لمن قال باتہامہ فی الولد والوالد اولمن خصص التھمۃ بالولد دون الوالد۔ اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ابن خلدون اس کو تسلیم کر رہے ہیں کہ ایک قول کے مطابق بیٹے اور باپ دونوں کے حق میں ولایت عہد موجبِ تہمت ہے اور دوسرے قول کے مطابق صرف بیٹے کو ولی عہد بنانا باعثِ اتہام ہے۔ البتہ ابن خلدون ان اقوال سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے یہ بیان کر رہے ہیں کہ ایسا کرنے میں امام متہم نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر امام کا زندگی میں اُن سے حُسنِ سلوک قابلِ اعتراض نہیں تو زندگی کے بعد کیوں ہو؟ لیکن یہ ایک ایسا استدلال ہے جس کی کمزوری واضح ہے۔ زندگی میں خلیفہ اگر اپنے عزیزوں کا لحاظ رکھے، تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد انہیں ولی عہد بھی بنا جائے؟ اعزہ کو مناصب دینا تو زندگی میں بھی مامون عن التھمت نہیں، چہ جائیکہ مرنے کے بعد ہو، جبکہ ولی عہدی کا مجوز خلیفہ ہی نہیں رہتا۔ اس مقام پر یزید کی ولی عہدی کے متعلق ابن خلدون نے جو کچھ مزید لکھا ہے اُسے عثمانی صاحب نے آگے چل کر خود ہی نقل کر دیا ہے، اور وہ یہ ہے:

"حضرت معاویہؓ کے دل میں دوسروں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا جو داعیہ پیدا ہوا، اس کی وجہ امت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی۔ بنو امیہ کے اہل حل و عقد اس پر متفق ہو گئے تھے، کیونکہ وہ اس وقت اپنے علاوہ کسی اور پر راضی نہ ہوتے اور اس وقت قریش کی سربرآوردہ جماعت وہی تھی اور اہلِ ملت کی اکثریت انہی میں سے تھی۔ اس لیے حضرت معاویہؓ نے اس کو ترجیح دی اور افضل سے غیر افضل کی طرف رجوع کیا۔ حضرت معاویہؓ کی عدالت اور صحابیت اس کے سوا کچھ اور گمان کرنے سے مانع ہے۔"

ابن خلدون اسی سے ملتے جلتے الفاظ میں یزید کی ولی عہدی کی توجیہ اس سے ذرا پہلے (اٹھائیسویں فصل) میں بھی کر چکے ہیں، جہاں انہوں نے خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے پر بحث کی ہے۔ وہاں لکھتے ہیں:

وکذالک عھد معاویۃ الی یزید خوفاً   اسی طرح معاویہؓ نے یزید کو ولی عہد بنایا کیونکہ انہیں

من افتراق الکلمۃ بما کانت بنو امیۃ لم یرضوا تسلیم الامر الی من سواھم فلو قد عھد الی غیرہ اختلفوا مع ان ظنھم کان بہ صالحًا

افتراق پیدا ہونے کا خوف تھا۔ وجہ یہ تھی کہ بنو امیہ اپنے سوا کسی دوسرے کو حکومت سپرد کرنے پر راضی نہ تھے۔ پس اگر امیر معاویہؓ کسی دوسرے کو ولی عہد بناتے تو بنو امیہ اس سے اختلاف کرتے اگرچہ وہ ان کے بارے میں نیک گمان رکھتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہت و ملوکیت، خلافت کی ملوکیت میں تبدیلی اور امامت و ولایت وغیرہ کی بحثوں میں ابن خلدون نے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ملوکیت بشری اجتماع اور انسانی معاشرت کے لیے ایک ناگزیر ادارہ ہے اور قہر و تغلب اس کی لازمی خصوصیت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی آمد پر یہی ملوکیت خلافت کے قالب میں ڈھل جاتی ہے اور دینی مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہے مگر ایک کارفرما طاقت یعنی عصبیت خلافت کی پشت پر موجود رہتی ہے۔ چنانچہ بعثتِ نبوی اور خلافتِ راشدہ کے بعد جب نوبت حضرت معاویہؓ تک پہنچی تو یہی ملوکیت و عصبیت بنو امیہ میں منتقل اور مرتکز ہو گئی جو ان کے عصبیہ اور زور آور ہونے کا ایک ناگزیر بلکہ فطری تقاضا تھا۔ باقی جو کچھ ہوا وہ اس صورتِ حال کے قدرتی نتائج تھے اور یزید کی ولی عہدی اور بیعت منجملہ اُن کے ایک ہے۔ مَیں اس وقت اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا کہ شرعی، تاریخی اور عقلی لحاظ سے واقعات کی یہ تعبیر و توجیہ کس حد تک درست ہے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب بنو امیہ اول و آخر اپنی جمعیت و عصبیت کے مالک تھے، "قریش کی سربرآوردہ جماعت بھی وہی تھے اور اہلِ ملت کی اکثریت بھی انہی میں سے تھی" تو پھر اس افتراق اور عدمِ اتحاد و اتفاق کے خوف کی کیا معقول وجہ ہو سکتی تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کا باعث بنا؟ ظاہر ہے کہ جب ایک قبیلہ قابو یافتہ و مستولی ہے، خلیفہ بھی اُسی میں سے ہے، خلیفۂ وقت کا صاحبزادہ بھی پابندِ صوم و صلوٰۃ ہے اور دنبوی نجابت اور انتظامی صلاحیت کی بنا پر خلافت کا اہل ہے" تو پوری ملت اُسے والد کے بعد آپ سے آپ خلیفہ بنا لے گی اور دو چار آدمی اگر مخالف ہوئے بھی تو وہ کیا تیر مار لیں گے؟ ایسی مخالفتِ شاذہ نہ موجبِ تشتّت و افتراق ہو سکتی ہے، نہ انعقادِ خلافت میں قادح بن سکتی ہے۔

پھر عثمانی صاحب اسی مقام پر حافظ ابنِ کثیر کے حوالے سے یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ "جب حضرتِ معاویہؓ

نے حضرت حسنؓ سے صلح کی تھی تو انہی کو ولی عہد بھی بنایا تھا"۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اُس وقت بنو اُمیّہ اس پر کیسے راضی ہو گئے تھے؟ یا پھر وہ بات بھی صحیح ہے کہ یزید ہی نے حضرت حسنؓ کو زہر دلا کر اس واقعی یا موہوم افتراق کو رفع کیا تھا؟[1] واقعہ یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی نے اس کی "خلافت" کی راہ ہموار کر کے افتراق کو گھٹانے کے بجائے اور زیادہ بڑھا دیا۔ بالفرض اگر عثمانی صاحب یا علامہ ابن خلدون کی یہ بات صحیح بھی ہو کہ بنو امیہ اپنے سوا کسی دوسرے کو حکومت سپرد کرنے پر راضی نہ تھے، تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سارے قبیلۂ بنی اُمیّہ میں بس یزید ہی سب کی نگاہوں میں کھبا ہُوا تھا۔ حضرت عثمانؓ جن کے قصاص کا مطالبہ لے کر امیر معاویہؓ اُٹھے تھے، خود ان کے صاحبزادے کا واقعہ جو متعدد تاریخوں میں منقول ہے اور جسے عثمانی صاحب نے بھی اس بحث میں نقل کیا ہے، یہ ہے کہ یزید کو ولی عہد بنانے پر حضرت سعیدؓ بن عثمان نے امیر معاویہؓ سے شکایت کی کہ آپ نے اپنے

---

[1] متعدد علماء نے بصراحت یہ الزام یزید کے خلاف عائد کیا ہے جس کی اہلیتِ خلافت کا بلند بانگ دعویٰ عثمانی صاحب کر رہے ہیں۔ مولانا عبدالحق حقانی فرماتے ہیں: "حضرت حسنؓ کے بعد امیر معاویہؓ حکومت کرتے رہے۔ بعد ان کے ان کا بیٹا یزید بدبخت جانشین ہوُا۔ اس نالائق دنیا دار نے اس خوف سے کہ مبادا حضرت حسن خلافت کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لختِ جگر ہیں، ان کے روبرو مجھے کون پوچھے گا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلوا کر شہید کر دیا اور چند سال بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کربلا میں شہید کرا دیا۔ اس کم بخت کے بے دین ہونے میں کیا شک ہے؟" حاشیے میں فرماتے ہیں: "معاویہ حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہ کر کے آپ خلیفہ ہونا چاہتے تھے" (عقائد الاسلام طبع نہم صفحہ ۲۳۲ مطبوعہ ۱۳۵۰ھ دہلی، دلی پرنٹنگ ورکس)۔ یہ بھی واضح رہے کہ "عقائد الاسلام" کے آغاز میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دار العلوم دیوبند، مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دیوبند، مفتی کفایت اللہ صاحب کی تقاریظ موجود ہیں۔ سنن ابی داؤد، کتاب الآداب، ابواب اللباس کی جو حدیث ترجمان کی گزشتہ ماہانہ قسط میں نقل کی گئی ہے جس میں حضرت حسنؓ کی موت پر امیر معاویہؓ کے ردِ عمل کا ذکر ہے، اس حدیث کی شرح میں مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی نے بھی عون المعبود میں یہ لکھا ہے وکان وفاۃ الحسن رضی اللہ عنہ مسموما سمّتہ زوجتہ جعدۃ باشارۃ یزید بن معاویۃ سنۃ تسع واربعین او بعدھا (حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات زہر خورانی کے ذریعے سے ہوئی۔ آپ کی بیوی جعدہ نے یزید کے اشارے سے آپ کو زہر دے دیا۔ یہ ۴۹ھ یا اس کے بعد کا واقعہ ہے)۔ ابن حجر مکی، الصواعق المحرقہ ص ۸۶ پر فرماتے ہیں کہ یزید نے جعدہ کو ایک لاکھ درہم دے کر حضرت حسنؓ کو زہر دلوایا۔

بیٹے کو ولی عہد بنا دیا حالانکہ میرے والدین اس کے والدین سے اور میں اس سے افضل ہوں۔ انہی مؤرخین کا بیان یہ بھی ہے کہ امیر معاویہؓ نے انہیں راضی کرنے کے لیے خراسان کا والی بنا دیا۔ اسی ایک واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دعویٰ اور یزید کی ولی عہدی کی یہ توجیہ کہاں تک صحیح ہے کہ بنو امیہ میں صرف یزید ہی سب کی آنکھوں کا تارا تھا اور اگر اُسے ولی عہد نہ بنایا جاتا تو اہلِ ملت انتشار کا شکار ہو کر رہ جاتے۔ ابن خلدون تو دنیا سے اُٹھ گئے، کاش کہ عثمانی صاحب ہی ہمیں بتا دیں کہ بنو امیہ کے وہ کون کون سے ممتاز افراد تھے جو یزید ہی کو ولی عہد بنا دینے پر مصر تھے؟

پھر ابن خلدون کی یہ بات بھی عجیب ہے کہ بنو امیہ کے "اھل الحل والعقد" یزید کی ولی عہدی پر متفق تھے۔ خاندان بنی امیہ کے افراد پر آیا اُن اہلِ حل وعقد یا اہلِ شوریٰ کا اطلاق کسی طرح بھی درست ہے جنہیں انتخابِ خلیفہ میں دخل ہو سکتا ہے اور جو پوری امت کی نمائندگی کر سکتے تھے؟ دوسرے افراد تو درکنار خود امیر معاویہؓ کا شمار خلیفہ بننے سے پہلے اہلِ حل وعقد میں نہیں ہوتا تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفاء (مطبع بریلی ۱۲۸۶ھ) میں عبدالرحمٰن اشعری فقیہ شام کا قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے متعلق حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو الدرداءؓ سے فرمایا جبکہ وہ حضرت علی کے پاس گئے کہ وہ خلافت کو چھوڑ کر از سرِ نو شوریٰ بلائیں اور امیر معاویہ کو بھی شریک کریں:

من بایعہ خیر ممن لم یبایعہ وای مدخل لمعاویۃ فی الشوری وھو من الطلقاء الذین لا یجوز لھم الخلافۃ وھو وابوہ رؤوس الاحزاب فندما علی مسیرھما وتابا بین یدیہ[1]	جن لوگوں نے حضرت علیؓ سے بیعت کی ہے وہ اُن سے بہتر ہیں جنہوں نے نہیں کی۔ اور معاویہؓ کا شوریٰ میں کیا دخل ہے؟ وہ تو طلقاء میں سے ہیں جن کے لیے خلافت جائز نہیں اور وہ اور ان کے والد جنگِ احزاب کے سپہ سالار تھے۔ پس وہ دونوں اصحاب اپنی روش پر نادم ہوئے اور وہیں تائب ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابن خلدون کا یہ نظریہ تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے کہ بنو امیہ کسی ایسی زبردست

---

[1] یہی قول آگے ازالۃ الخفاء ص۱۱۱ پر بھی موجود ہے۔

جمعیت کے مالک تھے کہ اگر یزید کے بجائے کسی اور کو ولی عہد یا خلیفہ بنایا جاتا تو وہ اس کی خلافت کو چلنے نہ دیتے۔ یہ تو بالکل وہی بات ہے جو بعض اہلِ تشیع نے معترضانہ رنگ میں خلافتِ عثمانی کے بارے میں کہی ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ کو محض اس لیے خلیفہ بنایا گیا کہ ان کا قبیلہ طاقتور تھا۔ امام ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ (ج ۳، صفحہ ۱۶۶) میں اس نظریے پر ان الفاظ میں تنقید کی ہے:

كان عبد الرحمن من ابعد الناس عن الاغراض مع انه شاور جميع الناس ولم يكن لبني امية شوكة ولا كان في الشورى منهم احد غير عثمان	عبدالرحمٰنؓ بن عوف (جن کے سپرد خلیفہ کا نام تجویز کرنا تھا)، لوگوں میں سب سے زیادہ بے غرض تھے، پھر انہوں نے تمام مسلمانوں سے مشورہ لیا، اور امیہ کو کوئی طاقت حاصل نہ تھی اور حضرت عثمانؓ کے سوا ان میں سے کوئی شوریٰ میں نہ تھا۔

ولی عہدی کے بارے میں فقہاء کا اصل مسلک | میری اب تک کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب، امام ماوردی اور قاضی ابو یعلیٰ اس بات کے ہرگز قائل نہیں ہیں کہ باپ اگر بیٹے کو اپنے بعد بھی سے خلافت کا اہل سمجھے تو اُسے ولی عہد بنا سکتا ہے اور اس کا یہ فعل بالکل جائز و معتبر ہے۔ نیک نیتی کے لفظ کی گردان تو عثمانی صاحب بلا وجہ کر رہے ہیں۔ علمائے مذکورین سے کسی نے نیتِ فاعل سے بحث نہیں کی، نہ اس کا موقع و محل تھا۔ شاہ صاحب نے تو ولایتِ عہد کے مسئلے سے براہِ راست تعرض نہیں کیا، البتہ انہوں نے انتخابی خلافت اور استیلائی خلافت کا فرق واضح کر دیا ہے۔ اگر ولایتِ عہد کا کوئی تعلق انعقادِ خلافت سے نہیں ہے، جیسا کہ عثمانی صاحب نے تسلیم کیا ہے، تو شاہ صاحب نے جو طریقے برائے انعقادِ خلافت بیان کیے ہیں، ان میں سے کسی کا انطباق ولی عہد بنانے پر نہیں ہو سکتا۔ الماوردیؒ اور ابو یعلیٰ کی بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انعقادِ خلافت کا معیاری طریقہ بیعتِ اہلِ اختیار ہے اور ولی عہدی کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک جو متفق علیہ ہے وہ یہ ہے کہ ولی عہد شرائطِ خلافت کو بہترین حیثیت میں پورا کرتا ہو۔ دوسری شرط جو جمہور امت کے نزدیک لازم ہے وہ یہ کہ ولی عہد اگر بیٹا ہو تو اہلِ رائے سے مشورہ لیا جائے اور وہ بھی تسلیم کریں کہ بیٹا پوری امت میں خلافت کے لیے سب سے زیادہ (اہل و) مستحق ہے۔ خلافت

لے حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں

کی شرائط کا محض کسی درجے میں پایا جانا اور والد کا بیٹے کو اہل سمجھ لینا کافی نہیں ہے۔ ابن خلدونؒ نے بلاشبہ یزید کی ولی عہدی کو جائز کہا ہے اور اس کے ناگزیر وقتی بجانب ہونے کا فلسفہ بھی بیان کیا ہے مگر انہوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اس مسئلے میں تین مذاہب ہیں جن میں دو کے نزدیک یہ فعل موجب تہمت ہے۔

مولانا مودودی کی تصریحات اس سلسلۂ بحث میں یہ بات بھی قابلِ وضاحت ہے کہ مولانا عثمانی صاحب نے مولانا مودودی کے وہ دو فقرے تو نقل کر دیئے ہیں کہ "یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی۔ . . ."، لیکن اپنا موقف و مدعا واضح کرنے کے لیے "خلافت و ملوکیت" میں بعض دوسری عبارتیں جو انہوں نے لکھی تھیں، انہیں نقل نہیں فرمایا۔ مثال کے طور پر اس کتاب کے صفحہ ۱۴۵ پر یہ عبارت موجود ہے:

"خلافت علی منہاج النبوۃ کے بحال ہونے کی آخری صورت صرف یہ باقی رہ گئی تھی کہ حضرت معاویہؓ یا تو اپنے بعد اس منصب پر کسی شخص کے تقرر کا معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چھوڑ دیتے، یا اگر قطع نزاع کے لیے اپنی زندگی ہی میں جانشینی کا معاملہ طے کر جانا ضروری سمجھتے تو مسلمانوں کے اہل علم و اہل خیر کو جمع کر کے انہیں آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے دیتے کہ ولی عہدی کے لیے امت میں موزوں تر آدمی کون ہے۔ لیکن اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لیے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لے کر انہوں نے اس امکان کا بھی خاتمہ کر دیا۔"

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۲۴۶ پر "یزید کی ولی عہدی کا معاملہ" کے زیرِ عنوان یہ عبارت درج ہے:

"سب سے زیادہ حیرت مجھے اُس استدلال پر ہے جس سے یزید کی ولی عہدی کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض حضرات یہ تو مانتے ہیں کہ اس کارروائی سے بڑے نتائج برآمد ہوئے

---

[1] یزید کی ولی عہدی کے لیے بیعت اُس وقت لی گئی جبکہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت سعیدؓ بن زید زندہ تھے اور دونوں اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ پھر چاروں خلفائے راشدین کے صاحبزادگان (حضرت عبدالرحمٰن، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت سعید، حضرات حسنینؓ) بقید حیات تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت سعید بن العاص جیسے بزرگ موجود تھے۔ ان سب کو چھوڑ کر کیا یزید محض اس وجہ سے خلافت کے لیے اہل یا اہل تر تھا کہ وہ خلیفۂ وقت کا لڑکا تھا اور باپ کی نگاہ میں ولایت عہد کے لیے موزوں تھا؟

مگر وہ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ اگر یزید کو جانشین نامزد کر کے اپنی زندگی ہی میں اس کے لیے بیعت نہ لے لیتے تو ان کے بعد مسلمانوں میں خانہ جنگی ہوتی اور قیصرِ روم چڑھ آتا اور اسلامی ریاست ہی کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس لیے ان بدترین نتائج کی بہ نسبت وہ نتائج کمتر ہی بُرے ہیں جو یزید کو ولی عہد بنانے سے رُونما ہوئے تھے۔ مَیں پوچھتا ہوں کہ اگر فی الواقع حضرت معاویہؓ کا خیال یہ تھا کہ ان کے بعد کہیں جانشینی کے لیے امت میں خانہ جنگی برپا نہ ہو، اور اس بنا پر وہ یہ ضرورت محسوس فرماتے تھے کہ اپنی زندگی ہی میں اس کا فیصلہ کر کے اپنے ولی عہد کے لیے بیعت لے لیں، تو کیا وہ اس نہایت مبارک خیال کو عمل میں لانے کے لیے یہ صورت اختیار نہ فرما سکتے تھے کہ بقایائے صحابہ اور اکابر تابعین کو جمع کرتے اور ان سے کہتے کہ میری جانشینی کے لیے ایک موزوں آدمی کو میری زندگی ہی میں منتخب کر لو اور جس کو وہ لوگ منتخب کرتے، اس کے حق میں سب سے بیعت لے لیتے؟ اس طریقِ کار میں آخر کیا امر مانع تھا؟ اگر حضرت معاویہؓ یہ راہ اختیار کرتے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خانہ جنگی پھر بھی برپا ہوتی اور قیصرِ روم پھر بھی چڑھ آتا اور اسلامی ریاست کا خاتمہ کر ڈالتا؟"

مولانا مودودی نے جب یہ عبارتیں تحریر کی تھیں، اُس وقت تک "البلاغ" کی تنقید منظرِ عام پر نہیں آئی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں "البلاغ" کے اعتراضات کا اصولی اور جامع جواب موجود ہے۔ مدیر "البلاغ" نے جب لکھنا شروع کیا تو ان کے سامنے یہ عبارتیں موجود تھیں اور انہیں سامنے رکھتے ہوئے ہی انہوں نے ردوکد شروع کی مگر افسوس کہ انہوں نے انصاف و رواداری سے کام نہ لیا اور ولی عہدیِ یزید کے مسئلے میں نیک نیتی و بدنیتی اور جواز و عدمِ جواز پر غیر ضروری اور غیر متعلق بحث سے اصل موضوع کو اُلجھانے کی کوشش کی۔ کوئی غلط کام اگر پوری نیک نیتی سے کیا جائے تو کیا اس کی غلطی صحت میں بدل جائے گی یا اس کے نتائج واقع اور رونما نہ ہوں گے؟ کوئی عالم یا فقیہ اگر دو تین اشکالِ فعل کے بارے میں یہ لکھ دے کہ یہ بھی جائز اور وہ بھی جائز و واقع یا قابلِ نفاذ ہے تو کیا دونوں یکساں طور پر مباح یا موجبِ ثواب ہوں گی؟ مثال کے طور پر طلاق دینا جائز تو ہے مگر اس کی بعض صورتیں مباح، بعض مستحب اور بعض ممنوع ہیں۔ طلاق کا مشروع و مسنون موقع و محل اور احسن طریقہ یہ ہے کہ کسی معقول وجہ شرعی کی بنا پر عورت کو حالت طہر میں وطی کیے

بغیر ایک طلاقِ رجعی دی جائے حتیٰ کہ عدت گزر جائے۔ اب فرض کیا ایک شخص بلا وجہ جیس میں بیوی کو تین طلاق دفعۃً دے دے تو یہ مذاہبِ اربعہ بلکہ ظاہریہ کے نزدیک بھی مغلظہ ہو کر واقع اور نافذ تو ہو جائیگی مگر کیا اس کا مجرد جواز و نفاذ اسے مستحسن یا اعتراض سے بالاتر بنا دے گا؟ طلاق سے بھی واضح تر مثال نماز کی ہے۔ نماز با جماعت ہر مسلمان کی امامت میں ادا کرنا جائز ہے۔ اس پر پوری امت کا اتفاق و اجماع ہے۔ ہر برو فاجر کی اقتداء میں نماز کا جواز خود حدیث نبوی سے ثابت ہے، اس لیے اسے جائز ثابت کرنے کے لیے کسی فقیہ کا قول پیش کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا گھیراؤ کرنے والوں کے پیچھے بھی نماز پڑھنے کی اجازت اہلِ مدینہ کو دے دی تھی۔ مروان، حجاج اور یزید جیسے لوگوں کے پیچھے جلیل القدر صحابہؓ کرام نماز ادا کرتے تھے۔ لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب امامتیں یکساں طور پر جائز ہیں؟ پھر تو ہمارے مفتی صاحبان کو چاہیے کہ صاف فتویٰ صادر فرمائیں کہ امامتِ صغریٰ و امامتِ کبریٰ کے لیے ہر کس و ناکس کو تجویز کر دینا بالکل جائز اور صحیح ہے۔ (باقی)

دورۂ ترکی کے مشاہدات

از جناب خلیل حامدی صاحب

(۱۱)

جماعت کے لٹریچر کی اشاعت کے سلسلے میں صالح اوزجان صاحب نے یہ واقعہ بھی سنایا کہ جب میں نے "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" پمفلٹ شائع کیا تو یہ طے کر چکا تھا کہ اگر اس کی خاطر جیل بھی جانا پڑے تو دریغ نہ کروں گا۔ اس عزمِ صمیم کے ساتھ میں نے پوری احتیاطی تدابیر کے ساتھ یہ پمفلٹ چھاپ کر تقسیم کر دیا۔ چھ ماہ بعد ترکی کے اٹارنی جنرل کے علم میں جب یہ پمفلٹ آیا تو اُس نے ایک تقریب کے موقع پر مجھ سے کہا، صالح، اگر چھ ماہ کے اندر اندر یہ پمفلٹ میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں اسے ضرور ضبط کرا دیتا، مگر ترکی قانون کی رُو سے اگر کسی مطبوعہ چیز کو چھ ماہ گزر جائیں تو وہ قانون کی رو سے باہر ہو جاتا ہے[1]۔

---

[1] صالح اوزجان کے خلاف مقدمات کا ذکر پچھلی قسط میں ہو چکا ہے۔ اب بیروت کے ہفت روزہ الشہاب سے ان پر مقدمات کی تازہ تفصیل ملی ہے۔ الشہاب لکھتا ہے "صالح اوزجان پر ایک مقدمہ استنبول میں اور دوسرا انقرہ میں چل رہا ہے۔ ان پر الزام یہ ہے کہ انہوں نے سیّد قطب کی کتاب "المستقبل لھذا الدّین" (اس دین کا مستقبل) کا ترکی ترجمہ شائع کیا ہے اور اس میں ایک مذہبی ریاست قائم کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ اس وقت کورٹ آف اپیل میں ہے۔ نچلی عدالت سے صالح اوزجان کے خلاف فیصلہ صادر ہو چکا ہے جس کی رُو سے انہیں چھ ماہ قید اور چھ ماہ کی بلنکسر کے مقام پر جلاوطنی کی سزا سنائی گئی ہے۔ بلنکسر انقرہ سے ۳۶۰ میل دُور ہے۔ اُن کے خلاف اور بھی متعدد مقدمات چل رہے ہیں۔ ایک مولانا مودودی کا چودہ صد سالہ جشنِ قرآن سے متعلق ایک پیغام چھاپنے پر۔ اور مولانا مودودی کی کتاب الجہاد فی سبیل اللہ اور سید قطب کا الجہاد کے عنوان پر ایک مضمون چھاپنے کی وجہ سے۔ (الشہاب یکم دسمبر ۱۹۶۹ء)۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو ثابت قدم اور سرفراز رکھے۔

افکارِ نورسی | بدیع الزماں نورسی مرحوم صالح اوزجان سے بڑا مشفقانہ برتاؤ رکھتے تھے۔ ان کے جذبہ وجہاد کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ صالح اوزجان نے نورسی مرحوم کو منہاج الانقلاب الاسلامی (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کا عربی ترجمہ) پڑھ کر سنائی۔ مرحوم نے اِسے بالاستیعاب سُن کر فرمایا: یہ کتاب میرے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ اِسے خوب پھیلاؤ۔ چنانچہ طلبائے نور اسے نہایت اہتمام سے پڑھتے ہیں۔ صالح اوزجان کے بیان کے مطابق یہ کتاب طلبائے نور کا دستور العمل ہے۔ بدیع الزماں نورسی مرحوم کے شاگرد ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ مرحوم کے مواعظ اور مقولے اُن کے نوکِ زبان رہتے ہیں۔ صالح اوزجان نے مجھے مرحوم کے بے شمار شذرات سنائے، جن میں سے چند ایک ابھی تک میرے ذہن میں گونج رہے ہیں:

- دین زندگی کی روح، اس کا نور اور اس کی بنیاد ہے۔
- ملت اسلامی کا احیاء دین کے احیاء کے بغیر نہ ہو سکے گا۔
- یہ دَور مریض ہے، یہ انسان مریض ہے، اس کا علاج قرآنِ کریم کا اتباع ہے۔
- تفرقہ قبلہ کے اتحاد سے دُور ہو سکتا ہے اور قبلہ قرآن ہے۔
- یہ زمانہ طریقت کا زمانہ نہیں ہے بلکہ حقیقت کا زمانہ ہے، اور حقیقت تمام تر قرآن وسنت میں موجود ہے۔
- عہدِ حاضر کی تمام صحیح اسلامی تحریکیں ہماری جماعت ہیں۔ ہم میں اور اُن میں صرف طریقِ کار کا فرق ہے۔
- فرد فنا ہو جائے گا تحریک باقی رہے گی۔
- شخصیت پرستی سے بچو شخصیت تودۂ برف ہے۔ اس تودے کو جماعت کے حوض میں ڈال دو تاکہ سارا حوض اُس کی صفت سے متصف ہو جائے۔
- اگر یک جہتی اور مساوات ہو تو ایک کا ہندسہ تین مرتبہ برابر لکھنے سے ۱۱۱ بن جاتا ہے اور چار کا ہندسہ چار مرتبہ برابر لکھنے سے ۴۴۴۴ بن جاتا ہے۔ لیکن اگر چار کے ہندسے کو چار مرتبہ نیچے اوپر کر کے لکھا جائے تو یہ چار صرف ۱۶ بن کر رہ جائیں گے۔ جب کہ پہلی صورت میں یہ چار ہزار چار سو چوالیس تھے پہلی صورت

یک جہتی اور ہم آہنگی اور ہمقدمی سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری اونچ نیچ سے۔

— اگر آپ اپنے بھائی کو بات کرنے کا موقع دیں گے تو آپ خود بھی لذت اندوز ہوں گے۔

— رفیقو، ہنگامہ پرور نہ ہو بلکہ افہام و تفہیم کو شعار بناؤ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تفہیم کے ذریعہ یہ عظیم انقلاب برپا کیا تھا۔

— دارارقم وہ پہلا مدرسہ تھا جس میں چرواہے، ساربان اور غلام داخل ہوتے اور دنیا کے قائد بن کر نکلے۔ یہ تعلیمی طریقِ کار کا کرشمہ تھا"

میں نے صالح اوزجان سے کہا کہ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ نورسی مرحوم کی تعلیمات کو دوسری زبانوں میں منتقل کریں اور عالم اسلامی کی دوسری اسلامی تحریکوں کو بھی اُن سے روشناس کرائیں۔ جواب ملا کہ ہم مولانا محترم کی تعلیمات کو ترکی میں عام کر رہے ہیں، آپ نورسی کے افکار سے اہلِ پاکستان کو متعارف کرائیں۔ میں چپ ہو گیا کہ جواب تو خوب ہے مگر ع زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔

سفر قونیہ | آج دل کی قدیم آرزو پوری ہو رہی ہے۔ مثنوی مولانا روم بڑی عقیدت و شیفتگی سے پڑھی تھی۔ "بشنو از نے چوں حکایت میکند" میں اپنی ہی فطرت کی صدا سنائی دیتی تھی۔ ناشتہ کے دوران صالح اوزجان نے تجویز کر دیا کہ میں مولانا رومی کے شہر قونیہ جاؤں۔ وہاں طلبائے نور کا نہایت مضبوط مرکز ہے اُن سے ملاقات مفید رہے گی۔ صالح اوزجان نے ٹیلیفون سے قونیہ کے ایک ذمہ دار رفیق کو میری آمد کی اطلاع کر دی۔ مکان سے باہر نکلے تو بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سردی گو شدت اختیار کر چکی تھی مگر لطافت آمیز ہو رہی تھی۔ سفر بذریعہ بس تھا۔ مگر پریشانی اس لیے نہ تھی کہ ترکی بسوں کو اندر سے گرم رکھا جاتا ہے اور سیٹیں ریزرو ہوتی ہیں۔ صالح اوزجان کے دو ساتھی مسٹر کمال الدین اور محمد نجاتی میرے رفیق سفر تھے۔ اول الذکر انگریزی خوب جانتے ہیں اور ثانی الذکر عربی میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ دونوں نوری تحریک کے شیدائی ہیں، اور بڑے متحرک و سرگرم کارکن ہیں۔

ترکی میں چار شہروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انقرہ، استنبول، بورصہ اور قونیہ۔ استنبول کی فتح سے پہلے عثمانیوں کا دارالحکومت بورصہ تھا۔ اور قونیہ سلاجقۂ روم کا دارالحکومت تھا۔ انقرہ

سے قونیہ ۱۵۶ میل ہے۔ تاریخ کا یہ عجیب فیصلہ ہے کہ قونیہ سلاجقۂ روم کی عظیم سلطنت کا تین سو سال (۱۰۷۷ء ۔۔۔ ۱۳۰۰ء) تک مرکز رہا مگر آج اُس کی شہرت مسعود بن قلیج ارسلان کی وجہ سے نہیں جس نے قونیہ کو سلجوقیوں کا دار الحکومت بنایا، نہ غیاث الدین کیخسرو اوّل کی وجہ سے ہے جس نے بازنطینیوں سے کامیاب جنگیں لڑ کر انطاکیہ کو قلمرو اسلام میں شامل کر لیا، اور نہ عزالدین کیکاؤس اور علاء الدین کیقباد کی بدولت ہے جن کا دورِ حکمرانی سلاجقۂ روم کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے بلکہ اُس کی شہرت ایک دلق پوش اور بوریا نشین صوفی جلال الدین رُومی کی وجہ سے ہے جس کا مزار آج بھی قونیہ میں مرجع خلائق ہے اور رومی کی عظمت و رفعت کا دنیا کے اندر صدیوں سے نقش ثبت کر رہا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

راستے کے مناظر بارش نہ ہوتی تو ہم انقرہ سے قونیہ تین گھنٹوں میں پہنچ جاتے۔ سڑک بہت عمدہ ہے جو ۱۹۳۹ء تک موجود نہ تھی۔ ترکی ڈرائیور اُس رفتار کی اہتمام سے پابندی کرتا رہا جو سڑک کے کنارے جگہ جگہ تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔ جدّہ اور مکہ یا ریاض اور طائف کے درمیان سفر کرتے وقت سو سو کیلومیٹر بھی گزر جائیں تو آبادی نہیں ملتی۔ مگر ترکی آباد مُلک ہے۔ قونیہ کے راستے میں جگہ جگہ آبادیاں ہیں، انسانوں کی آمد و رفت ہے، طعام گاہیں اور تفریح گاہیں ہیں، سیاحوں کے خیمے اور استراحت کے ہوٹل ہیں، کچھ دور تک طویل پہاڑی سلسلہ ملے گا جس کے دامن شاداب اور سبز پوش ہیں۔ کھیت اور باغات ہیں۔ کلہ کوہ کو دیکھیں تو وہ برف کی سفید چادر اوڑھے ہوئے ہے اور دامنِ کوہ پہ نظر ڈالیں تو کھیتوں کی سبز و خوش رنگ چادر بچھی ہوئی۔ شکر بجرا سے لدے ہوئے ٹرک بار بار ہماری بس سے آگے نکلتے۔ ترک شکر بجرا سے چینی پیدا کرتے ہیں اور یہ ٹرک چینی کے کارخانوں کی طرف جا رہے ہیں۔ کمالی دور میں زراعت پر جو غیر معمولی توجہ دی گئی تھی اور جنگلات کی افزائش کی جو زبردست تحریک چلائی گئی تھی وہ اب بھی برق رفتار سے جاری ہے۔ زراعت کی موجودہ ترقی میں مشینی آلات کو دخل حاصل ہے یہ بھاری بھرکم امریکی اور فرانسیسی ٹریکٹر جو سڑک کے اردگرد چلتے نظر آتے ہیں عثمانیوں کے دور میں نہ تھے۔

راستے میں ہم اناطولیہ کے "قلبِ مُردہ" میں سے گزرتے ہیں۔ پھر اک کھاری پانی کی جھیل آتی ہے جسے ترغولو کہتے ہیں اس میں سے نمک بھی نکالا جاتا ہے۔

تُرک خانم اپنے ترک دوستوں سے استنبول اور انقرہ میں یہ سُن چکا تھا کہ ترکی کی دیہاتی عورت بڑی خوبیوں کی مالک ہے۔ انقرہ اور قونیہ کے دیہات میں وسط ایشیا سے آنے والے تُرکوں کا خالص خون موجود ہے۔ ترکی کی دیہاتی عورت ابھی تک وہی ڈھیلا ڈھالا اور تہ بہ تہ لباس پہنتی ہے جو وہ صدیوں سے پہنتی چلی آ رہی ہے۔ اُس کا صرف چہرہ اور ہاتھ ننگے ہوں گے۔ مگر جب وہ غیر مرد کا سامنا کرے گی تو منہ چھپائے گی یا دوسری طرف پھیرے گی۔ اس کا لباس کاشت یا کٹائی میں مردوں سے تعاون کرنے میں حائل نہیں ہوتا۔ راستے میں ایک مقام پر بس کھڑی ہو گئی۔ باہر تُرک عورتوں کا ایک گروہ کسی کام کے سلسلے میں جمع تھا۔ سب نے ایک سا لباس پہن رکھا تھا۔ بعض عورتوں نے چہروں کے اوپر بھی ایسا سیاہ رومال باندھ رکھا تھا جس سے صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ مَیں نے مسٹر کمال الدین سے پوچھا کہ یہ لباس سن رسیدہ عورتیں ہی پہنتی ہیں یا جوان لڑکیاں بھی۔ مسٹر کمال الدین نے بتایا کہ اکثر نوجوان لڑکیاں بھی اسی لباس کی پابندی کرتی ہیں۔ مگر قصبوں میں رہنے والی لڑکیاں اسکرٹ پہنتی ہیں اور جی میں آئے تو سر پہ ایک رومال باندھ لیتی ہیں۔ مسٹر کمال الدین نے بتایا کہ مصطفیٰ کمال کی یہ "اصلاح" کہ عورتیں حجاب ترک کر دیں شہروں اور قصبوں تک محدود رہی۔ اناطولیہ (اناضول) کی دیہاتی آبادیاں اس سے متاثر نہیں ہو سکیں۔ دیہات کے لوگ جب شہروں میں آتے ہیں تو وہ عورتوں کے عُریاں اور نیم عریاں لباس دیکھ کر سخت چیں بجبیں ہوتے ہیں۔ مسٹر کمال نے بتایا کہ ان کے ایک عزیز انقرہ آئے، اور دو روز بمشکل گزارنے کے بعد واپس گاؤں چلے گئے۔ کیونکہ انہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ انقرہ کی عُریانی خدا کے غضب کو دعوت دے رہی ہے گی۔ مسٹر کمال الدین کے بیان کردہ حجابی نمونے راستہ بھر نظر آتے رہے۔ دیہاتی عورت کے بارے میں مجموعی طور پر یہی تاثر قائم ہوا کہ یہ فی الواقع موم کی ناک نہیں ہے۔ قانون کے ذریعے اسے بے نقاب کرنے والے شکست کھا گئے ہیں مگر اس نے شکست نہیں کھائی۔ ترک دیہاتی عورت کے اندر یہ احساس بہت گہرا ہے کہ وہ ترکمان ہے۔ اس کے اسلاف وسطِ ایشیا سے اُٹھ کر یہاں آئے اور حکومت کرتے رہے ہیں اس کے آباؤ اجداد نے بازنطینی طاقتوں کو سرنگوں کیا ہے صلیبی حملہ آوروں کا منہ توڑا ہے۔ وہ غازی عثمان

کی بیٹی ہے وہ آل سلجوق کی نشانی ہے وہ اس قوم سے تعلق رکھتی ہے جس نے یورپ اور ایشیا کے بہت بڑے حصہ پر حکومت کی ہے۔ اور کسی بیرونی طاقت کی غلامی اُس نے نہیں کی۔ وہ آج بھی اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ اپنے قومی اور نسلی خصائل و عادات کو بچوں کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرے۔

عمامہ۔ ٹوپی اور ہیٹ | ۴۵-۵۰ برس کا ایک تُرک میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھی پچھلی سیٹوں پر اپنے بعض جاننے والوں کے پاس چلے گئے۔ تُرک نے اپنی زبان میں لگاتار اظہارِ خیال کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ دیکھ کر کہ مَیں اس کی بات کو نہیں سمجھ رہا ہوں اُس نے اشاروں سے باتیں شروع کر دیں۔ کسی قصبے کا معمولی پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے میری ٹوپی (سیاہ رنگ کی قراقلی) اُتار لی اور اپنے سر پر رکھ لی۔ اور بڑی خوشی کا اظہار کیا اور میری ٹوپی کو خوب داد دی۔ پھر میری گرم شیروانی کو بھی "عقیدت" سے چھونے لگا۔ یہاں تک تو مَیں یہ سمجھا کہ وہ مجھے یہ بتانا چاہتا ہے کہ پاکستان کا لباس اُسے پسند ہے یا اُسے ایسی ٹوپی اور شیروانی درکار ہے۔ مگر اس ایجابی انداز کے بعد اُس نے اب سلبی اسلوب بھی اختیار کیا۔ اُس نے اپنی کنارہ دار فوجی طرز کی ٹوپی سر سے اُتاری اور اُسے بڑی غضب آلود نگاہوں کے ساتھ ہاتھوں میں مسلنے لگا۔ اُس کے ٹوپی کو بار بار جھٹکنے سے مَیں سمجھ گیا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سرپوش جو ہمارے سروں پر جبراً ٹھونسا گیا ہے یہ اُسے سخت ناپسند ہے اور اُس کا بس چلے تو آج ہی اِسے ترکی سے دیس نکالا دے دے۔ مَیں نے دیکھا کہ کوئی ترک مسجد کے اندر سرپوش (خواہ وہ ہیٹ ہو یا کپڑے کی فوجی ٹوپی) لے کر نہیں جاتا۔ بلکہ اُسے مسجد کے دروازے پر محافظ کے حوالے کر دے گا اور نماز کے لیے سر پر سبز رنگ کی کپڑے کی بنی ہوئی ٹوپی اوڑھ لے گا۔ ایک مرتبہ انقرہ میں ایک صاحب سرپوش سمیت مسجد میں داخل ہو گئے۔ اس پر محمد نجاتی صاحب نے (جو میرے رفیقِ سفر ہیں)، بڑا واویلا کیا۔ مَیں نے کہا یہ معمولی بات ہے۔ کہنے لگے جسے آپ معمولی سمجھتے ہیں وہ ہمارے ہاں کا بڑا نازک مسئلہ ہے۔ تُرکی میں سرپوش کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ غازی اُورخاں (غازی عثمان خاں کے لڑکے)، نے مجاہدین کی ایک خصوصی فوج تیار کی اور اپنے عہد کے ایک صوفی بزرگ شیخ بکتاش سے درخواست کی کہ وہ مجاہدین کی اس فوج کے لیے دُعا فرمائیں۔ شیخ بکتاش نے پہلے دُعا مانگی اور پھر اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین ایک سپاہی کے سر پر ڈالی اور فرمایا: "اس فوج کا نام ینکی چری (نئی فوج) رکھا جائے۔ خدا اس فوج کو سُرخ رو رکھے، اس کے بازو

مضبوط، اس کی شمشیر قاطع اور اس کے نیزے پُر کار رہیں - اور یہ کامیاب و کامران لوٹا کرے "۔ ینگی چری بعد میں ینی چری سے تبدیل ہو گیا۔

فوج کے سپہ سالار امیر علاؤ الدین نے شیخ بکتاش کی بابرکت آستین کی یاد تازہ رکھنے کے لیے فوجیوں کے سروں کے عمامے پر شملے کا اضافہ کر دیا۔ بعد میں اس نوعیت کے عماموں کا رواج علماء اور فقہاء اور اعیانِ حکومت میں بھی پھیل گیا۔ سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸ء - ۱۸۳۹ء) نے جب ینی چری کی مسلسل بغاوتوں اور خرابیوں سے تنگ آکر اس کا خاتمہ کر دیا تو یہ عمامہ بھی تبدیل کر دیا اور اس کی جگہ لال ترکی ٹوپی کو رواج دیا۔ البتہ شیخ بکتاش کی آستین کی یاد تازہ رکھنے والے شملے کی جگہ ترکی ٹوپی کے اوپر پھُندنے کا اضافہ کر دیا۔ بعض اربابِ تحقیق یہ بیان کرتے ہیں کہ ینی چری کا سفید عمامہ "اخی تحریک" کا شعار تھا۔ یہ تحریک اناطولیہ کے ترکوں کے اندر بھائی چارہ اور اتحاد پیدا کرنے کے لیے علماء اور صوفیاء نے جاری کی تھی۔ عثمان خاں بھی اس کا ایک رکن تھا۔ یہ تحریک اُس دور کی صحیح اسلامی تحریک تھی جس نے مسلمانوں کے اندر جہاد کی رُوح پھونکی۔ غازی عثمان خاںؒ نے تحریک کے سفید عمامے یا سفید ٹوپی کو ینی چری کا سرپوش قرار دیا۔ بہر حال سلطان محمود ثانی کے بعد عمامے کے بجائے لال ترکی ٹوپی جاری ہوئی جسے ہمارے ہاں فیض کیپ (صحیح نام ہے فاس کیپ) کہا جاتا ہے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۲۵ء کو مصطفیٰ کمال نے ایک قانون جاری کر کے ترکی ٹوپی کو ممنوع قرار دے دیا اور ہیٹ پہننے کا حکم دے دیا۔ اب سمجھ میں آگیا کہ محمد نجاتی کے نزدیک سرپوش کا مسئلہ کیوں نازک اور جذباتی ہے۔

اپنی روایتی ٹوپی سے ترکوں کے لیے دست بردار ہو جانا آسان نہ تھا۔ یہ ایک گول، بے کنارہ اور تقریباً مخروطی ٹوپی تھی۔ نماز ادا کرتے وقت سجدے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی، اور پیشانی بے تکلف زمین پر رکھی جا سکتی ہے۔ اتاترک کی رائے تھی کہ یہ قدیم اسلامی رواجوں کا نشان ہے اور وہ ترکوں کو ایسے نشانوں سے الگ کرنے پر تُلا ہُوا تھا۔ پھر وہ اور چند افسر قسطمونی گئے جسے قدامت پسندی میں خاص شہرت حاصل تھی۔ خود اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے ہیٹ پہن رکھے تھے۔ اتاترک نے خوف زدہ اہلِ شہر سے کہا: دیکھو، میں تمہارے لیے عمدہ تحفے لے کر آیا ہوں۔ یہ ہیٹ ہیں اور ترکی ٹوپی کے مقابلے میں دھوپ اور بچاؤ کا بدرجہا بہتر ذریعہ ہیں۔ اس اعلان کے بعد یہ تحفہ زبردستی لوگوں کے سروں پر ٹھونسنے کا حکم جاری ہوا۔

اناطولیہ میں ہیٹ پہن لینے کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ مذہب چھوڑ دیا ہے۔ سالوں تک حکومت کی پروپگنڈا مشینری یہ ثابت کرتی رہی کہ ترکی ٹوپی حقیقتاً ترکی نہیں ہے بلکہ اہلِ وینس سے لی گئی ہے تاکہ غیر موزوں اور بوجھل دستار کی جگہ لے سکے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ روپے اور طاقت کے بے پناہ استعمال کے باوجود اناطولیہ کا یہ ترک جو مجھ سے متعارف بھی نہیں تھا ہیٹ اور فوجی سرپوش سے بے پناہ نفرت کا اظہار کر رہا تھا۔

اتاترک کے مجسمے انقرہ اور استنبول میں اتاترک کے مجسمے دیکھ کر میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف شہروں تک محدود ہیں، مگر انقرہ سے لے کر قونیہ تک ڈیڑھ سو میل کے سفر کے دوران کوئی قابل ذکر جگہ ایسی نہ تھی جہاں اتاترک کا مجسمہ نصب نہ ہو۔ کہیں کسی سیاہ رنگ کی دھات کا مجسمہ اور کہیں پتھر کا۔ بلا مبالغہ یہ مجسمے سینکڑوں ہوں گے اور خدا معلوم "جمہوریہ ترکیہ" کے خزانے میں سے عوام کی "بہبود" کے لیے ان مجسموں پر کتنا روپیہ صرف کیا گیا ہوگا۔ میں تو صرف ڈیڑھ سو میل کے ایک ٹکڑے کی بات کر رہا ہوں۔ اناطولیہ کی دوسری سڑکوں کی حالت کیا اس سے مختلف ہوگی؟ میں نے اپنے رفیق محمد نجاتی سے اس پر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ نجاتی صاحب نے بتایا کہ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اتاترک نے اس پورے علاقے میں تحریک آزادی کی قیادت کی ہے۔ اور ۱۹۳۷ء تک وہ کامیاب غازی کی حیثیت سے متعارف رہا ہے۔ اس لیے اس خطے میں شروع شروع میں اُسے خوب مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اور دوسری وجہ ہے کہ جس فوجی جرنیل کو اتاترک نے اس علاقے کا گورنر بنایا تھا وہ سخت مغرب زدہ اور اتاترک کا زبردست حامی اور معتقد اور وفادار تھا۔ یہ مجسمے اُسی نے جگہ جگہ نصب کروائے ہیں۔

محمد نجاتی صاحب سے یہ بھی پتہ چلا کہ غازی اتاترک نے اپنے مجسمے ترشوانے کے لیے خاص طور پر جرمنی کے مجسمہ سازوں کی خدمات حاصل کیں اور متعدد قوی ہیکل مجسمے تراش کر تمام شہروں میں نصب کیے گئے اور انہیں سلامی دی گئی۔ یہ اس امر کا اعلان تھا کہ ترکی فنونِ لطیفہ کو ترقی دے رہا ہے۔ عثمانیوں نے صرف فنِ تعمیر یا کتابوں کی جلد سازی پر توجہ دی تھی (حالانکہ یہ غلط ہے) اور ہم اس میں ہمہ جہت ترقی کر رہے ہیں۔ نیز ترکی کے مذہب پرست عناصر پر یہ واضح کر دینا مقصود تھا کہ جدید ثقافت اسلام کے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرے گی کہ بت تراشی اور بت پرستی حرام ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد جب عدنان مندریس

پر برسرِ اقتدار آیا تو لوگوں نے یکایک اِن مجسّموں پر حملہ کر دیا اور اُن میں سے کئی ایک توڑ ڈالے یا اُن کی توہین کی۔ اس پر حکومت کو مجسّموں کے احترام کے لیے خاص قانون نافذ کرنا پڑا جو اَب تک نافذ العمل ہے۔

قونیہ کے راستے میں جہاں جہاں آبادیاں ہیں مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو ڈرائیور نے ایک ایسے مقام پر بس روک دی جہاں مسجد سڑک کے بالکل قریب تھی۔ بس کے بعض مسافروں نے ہمارے ساتھ مل کر مسجد میں نماز ادا کی۔ مَیں نے دیکھا کہ تُرک ہر نماز کے لیے وضو کرتے ہیں اور جرابوں پر مسح نہ خود کرتے ہیں، نہ دوسرے کے مسح کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ سخت سردی کے اندر یخ بستہ پانی سے وضو کریں گے مگر جرابوں پر ہرگز مسح نہ کریں گے، خواہ وہ کتنی ہی موٹی کیوں نہ ہوں۔ عصر کی نماز بھی ہم نے راستے ہی میں ادا کی۔ مغرب سے ایک گھنٹہ قبل ہم قونیہ میں داخل ہوئے۔

قونیہ میں داخل ہونے سے پیشتر یکایک نگاہیں ایسی قدیم عمارات پر پڑتی ہیں جو استنبول کی تاریخی عمارات سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ یہ سلجوقی عمارات ہیں۔ اپنے زمانے میں یہ سرائیں تھیں یا اسلامی مدرسے تھے۔ سلجوقیوں کے دَور میں شہر کے اردگرد نگرانی کے لیے بلند برج بنے ہوئے تھے جن پر چوکیدار پہرہ دیتے تھے۔ شہر کے اردگرد فصیل بنی ہوئی ہے جس میں داخلے کے دروازے تنگ ہیں۔ بسوں کے اڈے میں اُتر کر ہم پیدل چلتے رہے اور قونیہ کی نوری تحریک کے ایک ممتاز کارکن کی بیکری میں چلے گئے۔ مغرب کے بعد مولانا روم کا مزار بند ہو جاتا ہے اس لیے ہمارے میزبان نے تجویز کیا کہ مولانا کی قبر پر فاتحہ پڑھ لی جائے اور اُن کا عجائب گھر دیکھ لیا جائے۔

تربتِ رومی

مزار کے زائرین کی اکثریت یورپی سیاحوں پر مشتمل تھی۔ اور وہ رُوحانی عقیدت کے اظہار کے بجائے فنِ تعمیر اور تاریخی آثار و تبرکات میں منہمک رہے۔ مولانا روم کی قبر، اُن کے والد، اور اُن کے خلفاء، اور دوسرے سلجوقی بزرگوں کی قبریں بہت وسیع و عریض عمارت کے اندر ہیں جس کے پہلوؤں میں حجرے بنے ہوئے ہیں۔ بیرونی صدر دروازے کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں: "حضرت مولانا"۔ تُرک جب مولانا کہیں گے تو اس سے اُن کا اشارہ مولانا رومی کی طرف ہو گا اور مولوی سے اُن کی مراد مولانا رومی کے مریدین ہوتے ہیں۔ مولانا رومی کے سلسلۂ تصوّف کو طریقۂ مولویہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

علماء کے لیے ترک مولانا یا مولوی کے لفظ کے بجائے "حضرت" کہیں گے۔ چنانچہ میں پورے قیامِ ترکی میں "حضرت مودودی" کا لفظ سنتا رہا ہوں۔ جیسے سعودی عرب میں "شیخ مودودی"۔

تعلیمات رومی اور اخی تحریک حضرت علی ہجویریؒ نے جس طرح تعلیم و تزکیہ اور دعوت و ارشاد کی مہم جاری کی تھی اُسی طرح مولانا رومی نے بھی اپنے عہد میں اصلاح و تربیت کی تحریک چلائی۔ مگر پیروکاروں نے مرورِ زمانہ سے دونوں بزرگوں کے بارے میں عقیدت کے جذبات تو مبالغہ کی حد تک دکھائے مگر اصل دعوت کو فراموش کر دیا۔ مولانا روم کی مثنوی جسے "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کہا گیا، کیا ہے؟ ایک دفترِ بے پایاں ہے جس میں اسلامی اخلاق، روحانی اوصاف، معاشرتی آداب، حکمتِ قرآن، حکیمانہ طرزِ اصلاح، جہاد و قتال، فرائضِ حکمرانی، دنیا پرستی سے نفرت، صحیح علم، حقیقی معرفت، مقامِ عبدیت اور حقیقتِ توحید کا درس دیا گیا ہے۔ مولانا روم کی یہ تصنیف اُس ماحول کو سامنے رکھ کر پڑھنی چاہیے جب اناطولیہ میں سلجوقی سلطنت دم توڑ رہی تھی، تاتاری طوفان مشرقی اناطولیہ میں داخل ہو چکا تھا۔ سلجوقی امراء آپس میں دست و گریباں تھے۔ اور مختلف امراء نے اپنی چھوٹی چھوٹی مستقل ریاستیں قائم کر لی تھیں جن کی تعداد ۹ تک پہنچ چکی تھی۔ سلجوقیوں کے بعد اُبھرنے والی نئی اسلامی طاقت (ترکانِ عثمانی) ابھی میدانِ کارزار میں نہیں آئی تھی۔ اس داخلی سیاسی انتشار کے ہوتے ہوئے تاتاری طوفان کی یلغار نہ صرف مولانا رومی کو پریشان کر رہی تھی بلکہ ہر بہی خواہ ملت سراسیمگی میں مبتلا تھا۔ تاتاری حملوں سے ترکانِ اناطولیہ کو زبردست جانی، مالی اور روحانی نقصان پہنچ رہے تھے۔

مولانا رومی نے اپنے حکیمانہ مواعظ سے اناطولیہ میں جو اثرات چھوڑے انہیں کے نتیجہ میں بعد میں اخی تحریک کے نام سے اسلامی اتحاد کی زبردست تحریک برپا ہو گئی۔ صوفی سرداروں نے مذہبی رنگ دینے کے لیے اخی کا نام دیا۔ علماء اور صوفیاء کرام نے اس کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی اور روحانی اقدار کو بیدار کرنے کی مہم چلائی۔ سلجوقی زوال کے بعد یہ تحریک پورے اناطولیہ میں پھیل گئی اور اس نے سماجی اور اقتصادی تنظیم کی شکل اختیار کر لی۔ عثمان خان نے بھی اس میں شرکت کی۔ اِس تحریک کے لوگ خود محنت کرتے، دوسروں کی مدد کرتے اور راہِ خدا میں تاتاریوں کے خلاف جہاد کرتے۔ اس تحریک کے باعث اتراکِ روم میں جان

پڑ گئی اور عوام الناس کے مایوسی کے خیالات ختم ہو گئے۔ انقرہ کے علاقوں میں اس تحریک کی حکومت قائم ہو گئی۔ غازی عثمان خان اس تحریک کا ایک رکن تھا۔ بعد میں جب عثمان خان نے عثمانی سلطنت کی بنیاد رکھی تو اس تحریک نے اس کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ بلکہ تحریک کے زیر اقتدار علاقے عثمانی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ اس عظیم الشان کارنامے کو نظر انداز کر کے مولانا رومی کی تعلیمات کو وجد و سماع اور رقص و نغمہ کی دعوت کہنا صحیح نہیں ہے۔ دمشق اور قونیہ میں مولوی طریقہ کے درویش آج تک جو رقص کرتے چلے آرہے ہیں وہ ان کی اپنی ایجاد ہے۔

رومی عجائب گھر | مولانا روم کی قبر کی ساخت میں بھی اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ سر اونچا ہو اور پائنتی کا رخ پست رہے۔ تمام قبریں ریشمی غلافوں سے مستور ہیں اور ان پر سونے چاندی کے تاروں سے قرآن کریم کی آیات اور بیل بوٹے کڑھے ہوئے ہیں۔ تمام قبروں کے سرہانے عمامے رکھے ہوئے ہیں۔ جن کے شملے نیچے لٹک رہے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ دورِ جہاد کا رواج ہے۔ صوفیاء، علماء اور مجاہدین اپنے کفن کا کپڑا عماموں کی شکل میں سر پر باندھے رکھتے تھے۔ مگر مرنے کے بعد ان کے ورثاء اسے کفن کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے قبر کے اوپر رکھ دیتے تھے۔ راقم الحروف نے دمشق میں غازی صلاح الدین ایوبی کی تربت پر بھی غازیؒ کا عمامہ اسی حالت میں رکھا ہوا دیکھا ہے۔ یہ تربت جامع اموی کے پہلو میں واقع ہے۔ مولانا رومی کی تربت کے پاس ہر وقت میوزک بجتا رہتا ہے۔ بجانے والا نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے ٹیپ ریکارڈر سے یہ خدمت لی جاتی ہو۔ اس میوزک میں مولانا رومی کی مثنوی کو بڑی سُریلی اور وجد آور دھنوں میں ڈھال کر اندرونی ماحول کو مسحور کیا جاتا ہے۔ مقبرے کی ساخت اور اندرونی اور بیرونی نقوش کی ہم آہنگی بھی بڑی دل آویز ہے۔ مولانا روم کا مقبرہ سلجوقی سلطان علاؤ الدین کیقباد نے تعمیر کروایا تھا۔

ملحقہ حجرے عجائب گھر کا کام دے رہے ہیں۔ پہلے یہ درویشوں کے مطالعہ و مراقبہ کے لیے وقف تھے۔ ایک چھوٹی سی مسجد بھی اندر ہی بنی ہوئی ہے۔ ایک بڑا سا صحن بھی ہے جس میں وجد و رقص کی محفلیں جمتی چلی آرہی ہیں۔ مولانا روم کا خود نوشت مثنوی کا نسخہ، مثنوی کی شروح، مولانا کے اپنے

اور خلفاء کے جبے، ہزار دانہ تسبیحیں، قرآن کریم کے قدیم نسخے جن میں ایک نسخہ ایک ہزار سال پرانا مخلف سازندے جو رقص کے دوران بجائے جاتے تھے، الغرض فرقۂ مولویہ سے متعلق بہت کچھ اس عجائب گھر میں موجود ہے۔ عقیدت مندوں کا یہ حال ہے کہ میں نے ایک صاحب کو عین مولانا کی قبر کے سامنے نماز پڑھتے دیکھا اگرچہ قبلے کا رُخ بھی اسی طرف تھا۔ قبر کے سامنے سربسجود غرقِ مراقبہ بہت لوگوں کو دیکھا۔ اور نکلتے وقت مسٹر کمال الدین نے مجھے اشارہ کیا کہ فارسی شعر کا یہ کتبہ بھی پڑھ لیں جو دیوار پر آویزاں ہے۔ وہ شعر تو مجھے پورا یاد نہیں رہا۔ مگر اُس کا مفہوم یہ ہے کہ "مولانا کی قبر کا ایک طواف سات ہزار سات سو ستر حجوں کے ثواب سے بہتر ہے" یہ ہے بے جا عقیدت۔

مولانا روم کے مزار سے متصل ہی جامع سلیمیہ ہے۔ مزار سے نکلے اور مغرب کی نماز کے لیے جامع سلیمیہ چلے گئے۔ جامع سلیمیہ سلطان سلیم ثانی (۱۵۶۶-۷۴ء) نے بنوائی تھی۔ دو میناروں والی یہ انتہائی خوبصورت مسجد قونیہ کے اندر عثمانی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اور اُسی عظمت و شکوہ کی حامل ہے جو استنبول میں اسی نام سے اس عظیم سلطان کی یادگار ہے۔ اِن دونوں کا معمار بھی ایک ہے، وہ ہے سنان پاشا جسے عثمانی فنِ تعمیر کا مُوجد اور رُوح کہا جاتا ہے۔ ترکی کی مشہور مسجدیں اور قصر اُسی کے کمالِ فن کا مظہر ہیں۔ مسجد میں حاضری خوب تھی۔ اور یہ شک دُور ہو گیا کہ رمضان کے بعد لوگ مسجد کا رُخ نہ کریں گے۔

مورچ نُور: شب باشی نُوری تحریک کے ایک انتھک کارکن حسن صاحب کے ہاں طے ہوئی۔ نمازِ عشاء کے بعد اُن کے مکان پر اخوانِ نُور کا بہت بڑا اجتماع منعقد ہو گیا۔ دوستوں نے بتایا کہ وقت کم ہونے کی وجہ سے تمام احباب کو اطلاع نہیں ہو سکی ورنہ حاضری دوگنی ہوتی۔ یہ سب لوگ چیدہ اور نمایاں ہیں۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی ہے۔ اُن کے روشن اور دمکتے چہرے ایمان و اخلاص کی منہ بولتی تصویر تھے اور نورِ علی نور کی شان جلوہ گر تھی۔ گفتگو کے لیے میرے ترجمان آیدین کے ایک رفیق کو منتخب کیا گیا جو نہایت شستہ اور رواں عربی بولتے تھے اور قونیہ کے ہائر اسلامک انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آیدین وہی شہر ہے جہاں عدنان مندریس مرحوم پیدا ہوئے۔ حاضرین میں عربی زبان جاننے والوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اُن سوالوں سے ہوا جو متعدد

لوگوں کی طرف سے عربی زبان میں کیے گئے۔

مجھ سے مطالبہ کیا گیا کہ میں جماعت اسلامی کی دعوت اور طریق کار پر مفصل روشنی ڈالوں۔ اس موضوع پر گو میں استنبول اور انقرہ میں اخوان نور کے اجتماعات میں تقریریں کرتا رہا ہوں، مگر قونیہ میں کچھ زیادہ ہی اس بارے میں تشنگی اور طلب کا اظہار کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قونیہ خالصتہً مشرقی شہر ہے اور استنبول و انقرہ کی نسبت یہاں کے ماحول پر اسلامی روایات کی چھاپ زیادہ مضبوط اور گہری ہے۔ اس لیے یہاں تحریکی جوش و خروش بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ صالح اوزجان مجھے پہلے باخبر کر چکے تھے کہ ازمیر کے بعد ہماری دعوت کا دوسرا مضبوط مرکز قونیہ ہے۔ میں نے جماعت کی دعوت کے چاروں نکات بیان کیے۔ اور بتایا کہ ان میں سے ہر ہر نکتہ پر اب تک کس حد تک کام ہو چکا ہے اور اُسے بروئے کار لانے کے لیے کیا کیا وسائل اختیار کیے گئے ہیں۔ کوشش کی کہ اختصار تو ہو مگر بات ادھوری نہ رہے اور اُکتا دینے والی طوالت سے بھی بچوں۔ بانیٔ تحریک کی سوانح حیات اور جماعت کی تاریخ بھی بیان کی۔ جماعت نے زندگی کے مختلف گوشوں میں جو کچھ جدوجہد کی ہے اس کی کسی حد تک وضاحت کر دی۔ اِس طرح کے مواقع بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ راقم الحروف نے پوری کوشش کی کہ یہ حضرات ہماری دعوت، نصب العین اور طریق کار سے کم از کم بنیادی طور پر واقف ہو جائیں۔ یہ ایک فرض ہے جسے ادا کرنا ترکی کی اسلامی تحریک اور پاکستان کی اسلامی تحریک دونوں کا مشترک تقاضا ہے۔ اس اجتماع میں یہ سوال خاص طور پر کیا گیا کہ جماعت نے خواتین کے حلقے میں کیا کام کیا ہے اور کیسے؟ استنبول و انقرہ میں مَیں نے اِس پہلو پر دو چار لفظوں میں اظہار خیال کیا تھا مگر یہاں تفصیل طلب کی گئی اور جواب بھی تفصیل کے ساتھ دے دیا گیا۔ سائل نے جواب سُن کر کہا کہ قونیہ میں بعض نوری خواتین بڑا قابل رشک دعوتی کام کر رہی ہیں اور ترکی کی مشہور داعیۂ اسلام شُعلہ یُکسل[1] نے قونیہ کے بار بار دورے کر کے یہاں کی خواتین میں بیداری کی لہر دوڑا دی ہے۔ یہ سُن کر طبیعت میں بڑی مسرت پیدا ہوئی۔ الحمد اللہ علی ذالک۔ (باقی)

---

[1] شُعلہ یُکسل کے بارے میں پچھلی قسطوں میں اشارہ کیا جا چکا ہے لیکن اب تازہ اطلاع یہ ملی ہے کہ موصوفہ کو ازمیر کی فوجداری عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے بندرما شہر میں "اسلام میں عورت کے فرائض" کے موضوع پر تقریر کی ہے۔ تقریر کے فوراً بعد ہی بندرما کے ڈپٹی کمشنر نے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے اور پولیس انہیں گرفتار بھی کرنے گئی مگر عوام کے جمِ غفیر نے موصوفہ کو گرفتار نہیں کرنے دیا۔ دراصل ملک کے طول و عرض میں شُعلہ نے تقریروں کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور ہزاروں مرد و خواتین اس سے متاثر ہو رہی ہیں اُسے روکنا مقصود ہے۔

عالمِ اسلام
حالات و واقعات کے آئینہ میں

[اس شمارے میں ہم ترجمان القرآن میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہے ہیں جس کا عنوان ہے "عالمِ اسلام حالات و واقعات کے آئینے میں"۔ اس باب میں ہم قارئین کرام کے سامنے عالمِ اسلام کے مختلف پہلو رکھیں گے۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اور ترکی سے موزمبیق تک اسلامی دنیا کی حدود پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس طویل و عریض خطہ میں مہینہ بھر میں ہونے والے اہم واقعات قارئین کے سامنے پیش کریں، اہم شخصیات کا تعارف کرائیں اور اہم کتابوں کا خلاصہ بیان کریں۔ اور خاص طور پر اسلامی تحریکوں کی سرگرمیوں اور اسلامی فکر و ثقافت کی رفتارِ ترقی سے قارئین کو روشناس کراتے رہیں۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس باب کو پسند فرمائیں گے اور اپنے تاثرات سے آگاہ کریں گے۔

خلیل حامدی]

انڈونیشیا اور اسرائیل۔ جنرل عبدالحارث کی تصریحات

انڈونیشیا میں روزانہ ایسے اجتماعات اور تقریبیں منعقد ہو رہی ہیں جن میں انڈونیشی عوام کو مسئلہ فلسطین کی تاریخ اور پس منظر سے آگاہ کیا جاتا ہے اور اُن سازشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے جو فلسطین اور بیت المقدس اور قبلۂ اول کے خلاف دنیا کی سامراجی اور صیہونی طاقتیں تیار کر رہی ہیں۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا اجتماع وہ تھا جو یکم دسمبر ۱۹۶۹ء کو غزوۂ بدر کی یاد میں "دفاع مسجد اقصیٰ کونسل" کی طرف سے منعقد کیا گیا۔ اس اجتماع میں انڈونیشیا کی اعلیٰ مشاورتی کونسل کے صدر جنرل عبدالحارث ناسوتیان نے بھی تقریر کی۔ موصوف کی تقریر کے اہم حصے یہ ہیں:

اس کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے مجھے کانفرنس میں شریک ہونے کی جو دعوت دی گئی ہے اُس کا میری ذات پر اور میرے افرادِ خاندان پر نہایت خوشگوار اثر ہوا ہے۔ میرے دل میں جس چیز نے سب سے زیادہ مسرت کے جذبات پیدا کیے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ حضرات کے اس اقدام نے میرے اس یقین کو مزید مضبوط کر دیا ہے کہ توحید خالص سے لبریز دل ہی مسلمانوں کے اندر اخوت و اتحاد کے رشتوں کو مستحکم کر سکتے ہیں۔ یہ بالکل واضح اور بدیہی حقیقت ہے۔ توحید دو بڑی شہادتوں پر مشتمل ہے ایک "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت اور دوسری "محمد رسول اللہ" کی شہادت۔ ان دونوں شہادتوں کے تقاضے ہیں جب ہم اللہ رب العالمین کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں تو ایک ہی طرح کے الفاظ ہماری زبان پر جاری ہو جاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کی طرف ہماری پیشانیاں خم ہو جاتی ہیں۔ فکر و نظر اور قبلہ کے اتحاد کو ہم پوری امتِ مسلمہ کے اتحاد کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔

آپ کی یہ تنظیم (دفاع مسجدِ اقصیٰ کونسل)، اور اس سے پہلے اسرائیلی جارحیت کا شکار ہونے والوں کے لیے قائم کی جانے والی کمیٹی اور اس کے ساتھ آپ کا تعاون، یہ باتیں واضح کرتی ہیں کہ ہم انڈونیشی مسلمان خاص طور پر اور پوری انڈونیشی قوم عام طور پر اپنی ملت اور قوم کے اندر مجاہدانہ کارروائیوں اور سرگرمیوں کو فروغ دینے کی سخت محتاج ہے۔ انڈونیشی ہونے کی حیثیت سے ہم نے اسرائیلی جارحیت کے معاملے میں ۱۹۶۶ء میں مشاورتی کونسل کے چوتھے سیشن میں اپنا موقف صاف صاف بیان کر دیا تھا۔ ہماری اس قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:

"فلسطینی عربوں کی جنگ حق، انصاف اور آزادی کی جنگ ہے۔ انڈونیشیا ہمیشہ اس جنگ میں اس وقت تک عربوں کا ساتھ دیتا رہے گا جب تک اسرائیل کے خلاف عربوں کی یہ جنگ اپنے اصل مقاصد سے ہمکنار نہیں ہو جاتی"

پھر جب جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے عربوں پر جارحانہ حملہ کیا تو اس قرارداد کی چھٹی دفعہ میں ذیل کے الفاظ کا اضافہ کر دیا:

"اسرائیل کے اس جارحانہ حملے کے پیشِ نظر انڈونیشیا یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ

اسرائیل اپنے علاقوں کی توسیع کے لیے جو کارروائیاں کر رہا ہے اُن کا کوئی جواز نہیں ہے اور اسرائیلی جارحیت کا نشانہ بننے والوں کی روز افزوں تعداد اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ انڈونیشیا عربوں کی زیادہ سے زیادہ امداد کرے۔"

مشرقِ اوسط کے ممالک کے متعدد اسلامی وفود ہم سے آکر ملے ہیں۔ اور مشرقِ اوسط کے حالات سے انہوں نے ہمیں آگاہ کیا ہے اور مشرقِ اوسط کے مسائل میں انڈونیشیا کے تعاون کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ہمیشہ ان وفود کے سامنے انڈونیشی عوام کے واضح موقف کی توثیق کی ہے جسے انڈونیشی حکومت اپنے عوام کے ساتھ مل کر عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ انڈونیشیا کا موقف یہ ہے کہ انڈونیشیا حق و انصاف اور آزادی کی راہ میں لڑنے والوں کا ہراول دستہ ہوگا۔

انڈونیشیا کے ۱۹۴۵ء کے دستور میں بھی اس امر کا اعلان کیا گیا ہے کہ "آزادی تمام اقوام کا حق ہے۔ لہٰذا دنیا میں جہاں کہیں بھی استعمار کا وجود پایا جائے اُس کا کلی خاتمہ کیا جانا چاہیے کیونکہ یہ انسانیت اور انصاف کے منافی ہے"۔ ۱۹۴۵ء کے دستور کا یہ حصہ آج بھی جوں کا توں قائم ہے۔

مسجدِ اقصیٰ کی دفاعی کونسل نے جاکرتا میں جو کانفرنس کی ہے اُس میں بھی میں نے اپنی تقریر میں اپنے چند تجربات اور کوششیں بیان کی تھیں جو میں نے اُس زمانے میں سرانجام دی تھیں جب میں دفاع اور امنِ عامہ کے امور کا سربراہ تھا۔ اس میں میں نے بتایا تھا کہ ہم نے جنوبی افریقہ کی عوامی تحریک سے لے کر شمالی افریقہ کی جنگِ آزادی تک کس کس طرح اپنے افریقی بھائیوں کی امداد کی تھی۔ ہم نے اس زمانے میں آزادی کے لیے لڑنے والی اِن اقوام کے پاس فوجی مشن بھیجے تھے۔ انڈونیشیا میں ان کے دفاتر قائم کیے، فوجی ماہرین تربیت کے لیے بھیجے اور ان کے خاص خاص مجاہدین کو عسکری تربیت دی۔ علاوہ ازیں اقوامِ متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی پلیٹ فارموں پر بھی ہم نے ہمیشہ اُن اقوام کے حق میں آواز اٹھائی۔ بنڈونگ میں ایشیا اور افریقہ کی آزادی پسند اقوام کی کانفرنس کا انعقاد بھی انڈونیشیا کے ان عناصر کی کوششوں کا نتیجہ تھا جو بیرونی طاقتوں کا آلۂ کار بنے بغیر صرف اپنے تاریخی اور قومی احساسات

کے تحت مظلوموں سے تعاون کے خواہاں تھے۔

اب سوچنے کا پہلو یہ ہے کہ اسرائیل کی سرکشی اور غرور میں اس قدر اضافہ کیوں ہو گیا ہے کہ اُسے یہ جرأت ہو گئی کہ وہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگا دے اور بیت المقدس پر قابض ہو جائے۔ دراصل بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ بین الاقوامی صیہونیت کی ایک کڑی ہے۔ یہودی ارد گرد کے تمام علاقوں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے انہوں نے اپنی فتوحات کا آغاز کیا تھا۔ وہ اب تک دس لاکھ فلسطینی مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال چکے ہیں۔ آخر یہودیوں کے حوصلے اس قدر کیوں بڑھ چکے ہیں۔ یہودیوں کے حوصلے بڑھنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ انہیں پختہ یقین ہے کہ مسلمان اس وقت انتشار اور تفرقہ اندازی کا شکار ہو چکے ہیں، اور خود عربوں کی صفوں میں اتحاد باقی نہیں رہا ہے۔ لہٰذا جب کبھی اقوام متحدہ کی طرف سے اسرائیل کی جارحیت کی مذمت کی جاتی ہے اور عربوں کے حقوق بحال کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اسرائیل اُسے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے اور اپنے ظلم و طغیان میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسرائیل مسجد اقصیٰ کی آتش زنی کے بعد بھی برابر جارحانہ کارروائیوں میں مصروف ہے۔ پچھلے چند دنوں سے اسرائیل نے اپنے تشدد میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے، اُس نے یہ احکام جاری کر دیئے ہیں کہ عربوں کی بستیوں کو پیوند خاک کر دیا جائے۔ اقوام متحدہ نے اس موقع پر بھی اسرائیل کو اس کارروائی سے باز رہنے کی تلقین کی ہے مگر اسرائیل نے سُنی اَن سُنی کر دی ہے۔ کیونکہ وہ مطمئن ہے کہ مسلمان پراگندہ ہیں اور عرب باہم لڑ رہے ہیں۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ اسرائیل کا یہ جارحانہ اقدام جس میں اُس نے مسلمانوں کے مقدس مقامات کی توہین کی ہے، عالمی پیمانے پر مسلمانوں کے اتحاد کا نقطۂ آغاز بن جاتا۔ اور قومی پیمانے پر انڈونیشیا میں اسلامی اتحاد کی فضا پیدا ہو جاتی۔ لیکن متعدد داخلی اور خارجی عوامل کی بنا پر ابھی تک ہم متحدہ تنظیم قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ بلکہ کوئی ایسی چھوٹی موٹی انجمن بھی نہیں بنا سکے جسے آگے چل کر وسیع تر اسلامی اتحاد کا ذریعہ بنا سکیں حالانکہ ہم اس وقت اسلامی بنیادوں پر متحد ہونے کے شدید ضرورت مند ہیں، خود صدر سوہارتو بھی سماٹرا میں اپنی تقریر کے دوران اس اتحاد کی ضرورت پر زور دے چکے ہیں۔ ملکی پیمانے پر مسلمانوں کی ایک کانفرنس کا قیام اصل غرض و غایت نہیں ہے بلکہ وہ مسلم عوام کے باہمی تعاون و مشاورت کا ایک ذریعہ بن

سکتی ہے تاکہ مسلمان متحدہ انڈونیشیا کی تعمیر میں اور انڈونیشیا کی روحانی اور مادی ترقی میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہم ابھی تک ایک ایسی ملّی کانفرنس کے انعقاد میں بھی بے بس ثابت ہو رہے ہیں۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہماری داخلی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک میں اسلام اور جمہوریت کے دشمنوں کی طرف سے برابر ایسی سازشیں کی جا رہی ہیں جو ان کوششوں میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں جو مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے سرانجام دی جا رہی ہیں۔ چنانچہ یہ وہی اسلام دشمن عناصر ہیں جنہوں نے مسجدِ اقصیٰ کے حادثہ فاجعہ کو بہانہ بنا کر نہ صرف خود انڈونیشیا کے اندر انتشار پھیلانے کی کوشش کی ہے بلکہ ہمارے اور عربوں کے درمیان اور ہمارے اور اسلامی ممالک کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہمیں باخبر رہنا چاہیے کہ یہودی عناصر مختلف اقتصادی اور ثقافتی بھیس بدل کر اور نشر و اشاعت اور رابطۂ عوام کے مختلف وسائل کے ذریعہ سے انڈونیشیا کے اندر گھس رہے ہیں، اور ہمارے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں اور اُن کے اندر یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ مسئلہ فلسطین اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے[1] حالانکہ مسجدِ اقصیٰ تمام دنیا کے مسلمانوں کی مقدس ترین مسجد ہے۔ اور وہ اس رُجحان کو رواج دے رہے ہیں کہ انڈونیشیا کی نظر میں مسئلہ فلسطین کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ ہمارا دستور اور اعلیٰ مشاورتی کونسل یہ قطعی فیصلہ کر چکے ہیں کہ انڈونیشیا لازماً اس قوم کا ساتھ دے گا جس کے وطن پر سامراجیوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ہمیں انڈونیشیا میں ان عناصر سے پوری طرح چوکنا رہنا چاہیے اور خالصتہً اسلامی اور ملّی اتحاد کو بروئے کار لا کر اپنے تحفظ کا فوری سامان مہیا کرنا چاہیے۔

مسجدِ اقصیٰ کی آزادی بیت المقدس کی آزادی سے وابستہ ہے اور بیت المقدِس کی آزادی کو فلسطین کے جہادِ آزادی سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہم فلسطین کی آزادی کی تحریکوں اور فلسطینی مجاہدین کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ وہ جائز دفاعی جنگ لڑ رہے ہیں اور ہم اُن عرب ممالک کی حمایت بھی

---

[1] عربوں کے سوشلسٹ عناصر کا بھی نقطۂ نظر ہے۔ وہ فلسطین کو مسلمانوں کا مسئلہ نہیں بلکہ صرف عربوں کا مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ اور عربوں کی بھی اُن طاقتوں تک اس مسئلے کو محصور رکھنا چاہتے ہیں جو ترقی پسند اور سوشلسٹ ہیں۔

کرتے ہیں جو اسرائیلی استعمار کو ختم کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ انڈونیشیا کی عوامی مشاورتی کونسل کی قرارداد نہایت صائب اور قطعی ہے اور اس معاملے میں افریقہ اور ایشیا کے عوام کا اتحاد انڈونیشیا کی آزاد اور مثبت سیاسی پالیسی کا عکاس ہے۔

مشرقِ اوسط کا جب کبھی کوئی وفد جاکارتہ کا دورہ کرتا ہے اور اُس کے ساتھ مسئلہ فلسطین زیرِ بحث آتا ہے تو فریقین اس مشترک نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے ایک آزمائش ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اسلام عالمگیر اور دائمی مذہب ہے۔ ہر دَور اور ہر قوم کے لیے موزوں و مفید ہے۔ لیکن اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان ہر جگہ شکست سے دوچار ہیں۔ اس کا آخر کیا سبب ہے؟ اس کا سبب صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو عملاً نافذ نہیں کیا ہے اور اسلامی احکام و قوانین کو کماحقہ ملک کے اندر عملی جامہ نہیں پہنایا ہے۔

مجھے امید ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل اس معاملے ہم سے زیادہ بہتر طور پر کامیابی حاصل کرے گی۔ اور امید ہے کہ آئندہ تمام لوگوں کو موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے ان فرائض و واجبات سے صحیح طور پر آگاہ ہوں جن کا دین تقاضا کرتا ہے اور جن سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہمیں اپنے عادلانہ جہاد پر اللہ کی نگرانی اور تائید کے تحت مسلسل کاربند رہنا چاہیے۔"

(روزنامہ الندوہ ۶ر جنوری ۱۹۷۰ء۔ ہفت روزہ الشہاب ۱۵ر جنوری ۱۹۷۰ء)

ملائشیا کے گزشتہ فسادات میں کن کا ہاتھ تھا؟

دو سرکاری رپورٹوں کا تجزیہ

۱۳ر مئی ۱۹۶۹ء کو ملائشیا میں یکایک فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور ملائی مسلمانوں اور چینیوں کے درمیان خونریز تصادم برپا ہوگیا۔ حال ہی میں ملائشیا کے فسادات پر دو سرکاری دستاویزیں شائع کی گئی ہیں۔ ایک قرطاس ابیض ہے جو ملائشیا کی نیشنل ایکشن کونسل کے صدر کی طرف سے شائع کیا

گیا ہے جو ان فسادات کو ختم کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اور دوسری دستاویز ملائشیا کے وزیر اعظم تنکو عبدالرحمان کی کتاب ہے، جس کا نام ہے: "۱۳ مئی سے پہلے اور اس کے بعد"

اِن دونوں کتابوں میں پہلے ان حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے جو وفاقی ملائشیا کے دارالحکومت کوالالمپور کے اندر خونی فسادات برپا ہونے سے پہلے وہاں پائے جاتے تھے۔ اور پھر اُن اسباب کی وضاحت کی گئی ہے جنہوں نے ملائشیا کی مختلف قوموں کے اندر مذہبی اور نسلی منافرت کی آگ بھڑکانے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حصّہ لیا ہے۔ دونوں کتابیں اس امر پر متفق ہیں کہ ملائشیا کی تاریخ میں ۱۳ مئی کے فسادات سے پہلے کبھی ایسے خونریز ہنگامے برپا نہیں ہوتے۔ اور ۱۳ مئی کے ہنگامے ملائشی قوم کا اِس لحاظ سے افسوسناک المیہ سمجھے جاتے ہیں کہ یہ قوم ایسے عناصر پر مشتمل ہے جو مذہب، زبان، ثقافت اور نظریات کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں۔ ملائشیا میں ایک ملائی قوم ہے جو جزیرۂ ملایا کے اصل باشندوں پر مشتمل ہے اور جس کی تعداد ۴۰ لاکھ ہے جب کہ ملک کی کل آبادی ۹۰ لاکھ ہے۔ یہ قوم صرف سرزمین ملایا (مغربی ملائشیا) میں آباد ہے۔ اور یہی اس کا اصل مسکن ہے۔ دوسری بڑی تعداد ان چینیوں کی ہے جو مختلف اوقات میں ہجرت کر کے ملائشیا کے مختلف حصّوں میں آ کر آباد ہوتے ہیں اور سالہا سال سے انہوں نے ملائشیا کو اپنا وطن بنا رکھا ہے۔ ان کی تعداد ۳۰ لاکھ ہے۔ تیسرا بڑا گروہ ہندوستانیوں کا ہے۔ ان کی پوزیشن بھی چینیوں جیسی ہے۔ اور صرف ۱۰ لاکھ ان کی آبادی ہے۔ اور باقی دوسری مختلف مذاہب و نسل کی اقلیتیں ہیں۔ لیکن ملک پر اثرانداز ہونے والی صرف تین بڑی قومیں ہیں یعنی ملائی، چینی اور ہندی۔

مذکورہ بالا دونوں کتابیں اس امر پر متفق ہیں کہ ۱۳ مئی ۱۹۶۹ء کو ملائشیا کے اندر جن اسباب و محرکات نے خونریز فسادات کو بھڑکایا ہے وہ تین ہیں:

۱۔ ملائشیا کے اندر پائے جانے والے کمیونسٹ عناصر اور اُن کے ایجنٹ

۲۔ وہ خطرناک گروہی سیاست جس پر ملائشیا کی بائیں بازو کی مخالف سیاسی جماعتیں کاربند ہیں۔

۳۔ چینیوں کی خفیہ جماعتیں جو چینی آبادی کی حفاظت کا دعویٰ کرتی ہیں اور اس حفاظت کے عوض وہ چینیوں سے بھاری بھرکم ٹیکس اور اُجرتیں وصول کرتی ہیں۔

یہ وہ تین اسباب ہیں جنہوں نے عوام الناس کے جذبات میں اشتعال پیدا کر دیا تھا اور بالآخر یہ مشتعل جذبات اور اُن کا ردِّ عمل فسادات کی صورت میں یکایک نمودار ہو گیا۔ یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ بائیں بازو کی مخالف جماعتیں اور چینیوں کی خفیہ تنظیمیں ملایا کی خلافِ قانون کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ قیادت کام کر رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ملائشیا کے اندر حالات کو خراب کرنے، باہمی کشمکش برپا کرنے اور قتل و غارتگری کی فضا کو جنم دینے میں ہمیشہ کمیونسٹوں کا ہاتھ کام کرتا رہا ہے۔

۱۰ مئی ۱۹۶۹ء کو ملائشیا میں نہایت امن و سکون کے ساتھ عام انتخابات منعقد ہوئے۔ ۱۱ مئی کو بائیں بازو کی مخالف جماعتوں نے "مظاہرات کامیابی" کے نام سے جلوس نکالے۔ مظاہرین نے ان جلوسوں کے اندر ملائشی حکام پر اور خاص طور پر سیکورٹی پولیس پر انتہائی نازیبا الفاظ میں حملے کیے اور دشنام طرازیاں کیں۔ اور مسلم عوام کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والے نعرے لگائے۔ جس کے نتیجے میں عوام کے اندر جوابی طیش بھڑک اٹھا اور ملائشی مسلمانوں نے ان کارروائیوں کو اپنے وطن، اپنے مذہب اور اپنی قومیت کے خلاف ایک زبردست چیلنج محسوس کیا چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے بھی شدید ردِّ عمل کے طور پر جوابی کارروائی کی گئی ہے "مظاہرات کامیابی" کا اہتمام کیا گیا کیونکہ یونینیسٹ پارٹی (جو حکمران پارٹی ہے) نے بھی انتخابات میں کلی شکست نہیں کھائی تھی۔ بلکہ اس کے برعکس اُسے بھی کامیابی نصیب ہوئی۔ گو اُسے دو تہائی اکثریت حاصل نہیں ہوئی جو اُسے سابقہ انتخابات میں حاصل ہوئی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ انتخابات کے نتائج یونینیسٹ پارٹی کی ہزیمت کا ثبوت نہیں فراہم کر رہے تھے۔ بلکہ معاملہ صرف اس قدر تھا کہ یونینیسٹ پارٹی غالب اکثریت سے محروم رہی۔ چنانچہ انتخابات کے بعد اگلے تین روز یعنی ۱۱، ۱۲، و ۱۳ مئی کو چیلنج اور جوابی چیلنج کا کھلم کھلا مظاہرہ کیا گیا۔ ایک طرف بائیں بازو کی مخالف جماعتیں تھیں جن کے ارکان چینیوں اور ہندیوں پر مشتمل تھے اور دوسری طرف جوابی کارروائی کرنے والی یونینیسٹ پارٹی تھی اور اس پارٹی کے وہ ارکان خاص طور پر اس ردِّ عمل میں پیش پیش تھے جن کا تعلق ملایا نیشنل یونین پارٹی سے ہے۔ یہ پارٹی یونینیسٹ پارٹی کا سب سے زیادہ مؤثر بازو ہے۔ اسی کشمکش کے نتیجے میں وہ خونیں فسادات اور نسلی جنگ برپا ہو گئی جس میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت کی کارروائیاں انجام دی گئیں سینکڑوں افراد موت کے گھاٹ اتر گئے اور مجرم اور بےگناہ کا امتیاز کیے بغیر خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ اور ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی جس کی نظیر ملائشیا کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ فسادات بڑھتے بڑھتے ملائشیا کے مسلمانوں اور باہر سے

آکر آباد ہونے والے چینیوں اور ہندیوں کے درمیان خوفناک مذہبی تصادم کی صورت اختیار کر گئے۔

ملائشیا کے بادشاہ نے ملک کے اندر ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔ اور نائب وزیر اعظم اور وزیر دفاع الحاج تون عبدالرزاق بن حسین کی ادارت میں نیشنل ایکشن کونسل قائم کر دی جسے تین امور کی تحقیقات کے فرائض سونپے گئے۔ ایک ملک میں قانون کی حکمرانی کی بحالی۔ دوسرے انتظامی مشینری کا تحفظ، اور تیسرے ملک کے مختلف گروہوں اور قوموں کے اندر الفت و یگانگت اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنا۔

ملائشیا کے وزیر اعظم تنکو عبدالرحمان کی کتاب "۱۳ مئی سے پہلے اور اس کے بعد" سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کونسل کا پہلا اور دوسرا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اور ملک کا نظم و نسق اور قانون کی حکمرانی پوری طرح بحال ہو چکی ہے۔ البتہ تیسرا کام نہایت مشکل ہے اور فطری طور پر اسے روبکار لانے کے لیے طویل مدت درکار ہے۔ کیونکہ شر پسند عناصر نے دلوں کے اندر جو منافرت پیدا کر دی تھی اُسے ختم کرنے کے لیے شدید محنت کی ضرورت ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ جب تک یہ تیسرا مقصد سرانجام نہیں پاتا پارلیمانی نظام کا اعادہ ناقابلِ تصور ہے۔ قرطاسِ ابیض کی رائے میں ملائشیا کے اندر اُبھر آنے والے مسائل کا حل یہ ہے کہ ملک کی سیاسی اور دستوری تاریخ کا صحت مندانہ شعور حاصل کیا جائے اور نسلی اور قومی احساسات کا صحیح اندازہ لگایا جائے اور کسی ایسی مثبت بنیاد کو تلاش کیا جائے جو باہمی مفاہمت و یگانگت کے احساس کو دوبارہ زندہ کرنے میں مدد دے۔

مئی ۱۹۶۹ء کے اواخر سے کر اب تک ہونے والے واقعات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملائشیا کی فضا اپنی سابقہ طبعی حالت کی طرف آ رہی ہے۔ صرف نسلی احساسات میں ابھی تک ایسا مادہ موجود ہے کہ اگر سیاسی پہلو سے اس کا ناجائز استحصال کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ دوبارہ پھٹ سکتا ہے اور ملک کے امن و امان کو بھسم کر سکتا ہے۔ مگر متعدد ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں جن سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ملک طبعی حالات کی طرف تیزی سے رجوع کر رہا ہے مثلاً:

ا۔ گزشتہ اگست میں ملک کے اندر یہ افواہ پھیلائی گئی کہ ۳۱ اگست کو جب ملائشیا کا قومی دن منایا جائے گا تو اسی پیمانے پر فسادات شروع ہو جائیں گے جو ۱۳ مئی کو رونما ہوتے ہیں یا اُن سے بھی زیادہ خوفناک لیکن تون عبدالرزاق نائب وزیر اعظم نے اس قسم کی افواہیں پھیلانے اور ان پر یقین کرنے کے بُرے انجام سے لوگوں کو متنبہ کر دیا، اور انہیں یہ اطمینان دلا دیا کہ ملک اس وقت تمام تر سکورٹی پولیس کے کنٹرول میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تہوار امن و سکون سے گزر گیا۔

۲۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی طرف سے کوالالمپور میں موسیقی اور ڈرامہ کانفرنس منعقد کی گئی مگر اس موقع پر بھی کوئی ایسا حادثہ رونما نہیں ہوا جو مہمانوں کو ناخوشگوار حالات سے دوچار کر دیتا۔

۳۔ گزشتہ ستمبر میں دوبارہ وسیع پیمانے پر یہ افواہ پھیلائی گئی کہ ہندوستانی مزدور ۵ اکتوبر کو ملائشیا کے طول و عرض میں ملک گیر ہڑتال کرنے والے ہیں۔ تون عبدالرزاق کی طرف سے اس موقع پر بھی افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی دھمکی دی گئی۔ اور اس طرح یہ دن بھی مفروضہ ہڑتال کے بغیر گزر گیا۔

۴۔ رمضان المبارک میں حسنِ قرات کا عالمی مقابلہ منعقد کیا گیا جس میں ۱۶ اسلامی ممالک اور اسلامی تنظیموں نے شرکت کی۔ یہ اجتماع گزشتہ سالوں کے اجتماعات سے بھی زیادہ بڑا تھا مگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

۵۔ نومبر کے تیسرے ہفتے میں ملائشی حجاج کی پہلی کھیپ روانہ ہوئی۔ گزشتہ سالوں کی نسبت اس سال بحری راستے سے جانے والے حاجیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور اگر ملک کے حالات اضطراب و انتشار کا بدستور شکار ہوتے تو اس تعداد میں اضافہ تو کجا سابقہ سالوں سے بھی کم تعداد کے جانے کا امکان تھا۔

ان دونوں رپورٹوں کے مذکورۂ بالا خلاصے سے قارئین یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کمیونسٹ عناصر کس طرح ملک کا امن و سکون بھسم کرتے ہیں اور لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانے کے لیے کن ہتھکنڈوں سے کام لیتے ہیں۔ اور نسلی اور علاقائی عصبیت بھڑکا کر کس طرح ایک ہی قوم کے مختلف افراد کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتے ہیں۔

امورِ حج کے بارے میں تازہ ترین اصلاحات

سعودی عرب کی وزارتِ اوقاف کی طرف سے حج کے امور کا جائزہ لینے کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اُس نے اپنی رپورٹ مکمل کر لی ہے۔ اس رپورٹ میں کمیٹی نے جو سفارشات تجویز کی ہیں ان میں سے دو سفارشیں نہایت اہم ہیں:

۱۔ تمام معلمین اور اُن کے کارندے ایسے سعودی باشندے ہوں جو پاکیزہ کردار اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہوں۔ اور حج کی دعاؤں کا صحیح تلفظ کرتے ہوں اور الفاظ کے مخارج سے پوری طرح آگاہ ہوں۔

۲۔ ایک ایسا انسٹی ٹیوٹ کھولا جائے جس کی مدتِ تعلیم چھ ماہ ہو۔ اور اس میں معلمین کو چاروں فقہی مذاہب کے مطابق حج اور عمرہ کے احکام کی تعلیم دی جائے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی ادارت کے فرائض حرم شریف کی دیکھ بھال

کرنے والے محکمے کے سپرد کیے جائیں! اور جو شخص بھی معلمی کا پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہو وہ لازماً اس ادارے میں داخل ہو۔ اور معلمی کا لائسنس صرف اسی شخص کو دیا جائے جس کے پاس اس انسٹی ٹیوٹ کا جاری کردہ تعلیمی سرٹیفکیٹ ہو۔ موجودہ لائسنس اس انسٹی ٹیوٹ کے آغاز کے چھ ماہ بعد منسوخ کر دیئے جائیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ مولانا مودودی مدظلہ العالی نے رابطۂ عالمِ اسلامی کے ایک اجلاس میں حج کے بارے میں جو اصلاحات تجویز کی تھیں ان میں ایک یہ اصلاح بھی تھی کہ معلّمین کی دینی و اخلاقی تربیت کا انتظام کیا جائے اور اس غرض کے لیے تربیتی مراکز قائم کیے جائیں۔ مذکورہ بالا اصلاحات انہی تجاویز کو پورا کرتی ہیں۔

<u>آئندہ شمارے میں</u> • اسرائیل ۱۹۷۰ء میں ایک اور بھرپور حملہ کرنے والا ہے؟ • مصر کے نامور عالمِ دین محب الدین الخطیب کا انتقال • ترکی کے دونمہ عناصر کے بارے میں ایک یہودی مصنف کے خیالات • سوڈان کی اسلامی یونیورسٹی کیوں بند کی گئی ہے۔ • عرب وزرائے تعلیم کی کانفرنس کی رُوداد۔

(بقیہ اشارات) کی ہیں جن میں پہلی تدبیر معاوضوں کے درمیان موجودہ غیر معمولی تفاوت کو کم کرنا ہے تاکہ ملک کے اندر طبقاتی تقسیم ختم ہو۔ نیز اس سلسلے میں یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ کسی محنت کش کے لیے کوئی معاوضہ اس حد سے کم نہ ہو جو موجودہ زمانے کی قیمتوں کے لحاظ سے ایک کنبے کی بنیادی ضروریات کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو مکان، علاج اور بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں مناسب سہولتیں دی جائیں۔ پھر تمام صنعتوں میں مزدوروں کو بونس بھی دیا جائے اور انہیں صنعتوں میں حصہ دار بنایا جائے۔ یہ اور اسی نوعیت کی بعض دوسری تدابیر کے ذریعے جن میں زکوٰۃ اور صدقات کے جمع کرنے کا انتظام اور ان کا شریعتِ اسلامی کے مطابق صرف، اور حرام راستوں میں دولت خرچ کرنے پر پابندیاں بھی شامل ہیں، ستم زدہ محنت کشوں کے حالات کو کافی حد تک بہتر بنایا جا سکتا ہے اور انہیں عملی طور پر یہ دکھایا جا سکتا ہے کہ سرمایہ داری کی لعنت ختم کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ انسان لازمی طور پر اشتراکیت کی غلامی کا طوق ہی گلے میں پہنے۔

اس منشور میں غیر مسلم اقلیتوں کو تمام شہری اور قانونی حقوق کی حفاظت کی ضمانت بھی دی گئی ہے اور ان سے

اس بات کا عہد کیا گیا ہے کہ حکومت نہ صرف اُن کے حقوق کی پوری طرح حفاظت اور پاسبانی کرے گی بلکہ انہیں اپنے تعلیمی اور تہذیبی معاملات میں جن وسائل کی ضرورت ہوگی وہ انہیں کشادہ دل سے فراہم کرے گی ۔ اکثریت کے طرزِ عمل یا حکومت کے نظم و نسق سے انہیں جو معقول شکایات ہوں گی انہیں رفع کرنے کی بھی پوری کوشش کی جائے گی ۔

خارجہ پالیسی کے بارے میں جماعت نے اس بنیادی موقف کو سامنے رکھا ہے کہ پاکستان چونکہ ایک اصولی اور نظریاتی مملکت ہے لہٰذا اس کی ملکی پالیسی کی طرح اس کی خارجی پالیسی بھی لازماً اس کے اختیار کردہ نظریۂ حیات پر مبنی ہونی چاہیے ۔ اسلام نے ہمیں ایک "اُمّتِ وسط" بنایا ہے اور ہم پر شہداء علی الناس کی ذمہ داری عائد کی ہے ۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری حکومت دنیا میں حق و انصاف کی علمبردار ہو اور ظلم و زیادتی کی پوری طرح مخالفت کرے ۔ خود راست بازی سے کام لے اور دوسروں کو راست بازی سے کام لینے پر آمادہ کرے ۔ اس بنا پر جماعت اسلامی ساری دنیا میں جس حد تک بھی ممکن ہو ، سامراجیت اور استعماریت کا زور توڑنے اور حق و انصاف کی عملداری قائم کرنے کی کوشش کرے گی اور اس کی حمایت ہمیشہ ان مظلوم قوموں کو حاصل ہوگی جو ان بلاؤں کی شکار ہیں ۔ اس منشور میں سیٹو اور سنٹو جیسے معاہدوں سے پاکستان کی وابستگی ختم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے ۔ کشمیر کے بارے میں زیادہ مؤثر قدم اٹھانے کا عہد کیا گیا ہے ۔ دنیا کے تمام ممالک کے ساتھ اچھے اور خوشگوار تعلقات استوار کرنے اور خاص طور پر عالمِ اسلام کے ساتھ قریب ترین تعلقات قائم کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے ۔

جماعت اسلامی کے منشور کے یہ چند اہم پہلو ہیں جنہیں یہاں مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے ۔ اس کی جامع سکیم تو پورا منشور دیکھ کر ہی سمجھ میں آسکتی ہے ۔ جو حضرات اس ملک کے معاملات میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہیں انہیں اس منشور کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ یہ منشور کوئی صحیفۂ آسمانی نہیں ہے ، بلکہ انسانی فکر و تدبیر کا ایک لائحہ عمل ہے جو ملک کے موجودہ حالات کو اسلامی اصولوں کے مطابق درست کرنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے ۔